January
2022

جدید ترادب کا اشاریہ

ماہنامہ

بیاض

لاہور

سالِ نو مبارک 2022

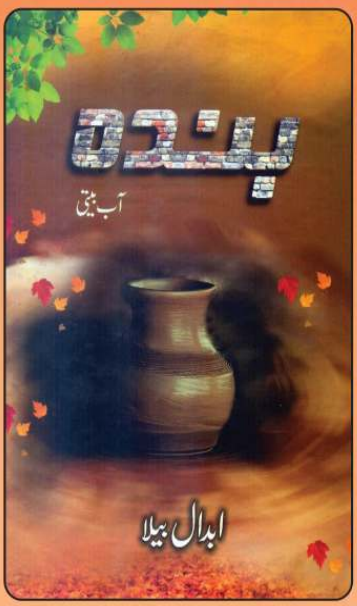
بندھن
آب بیتی
ابدال بیلا

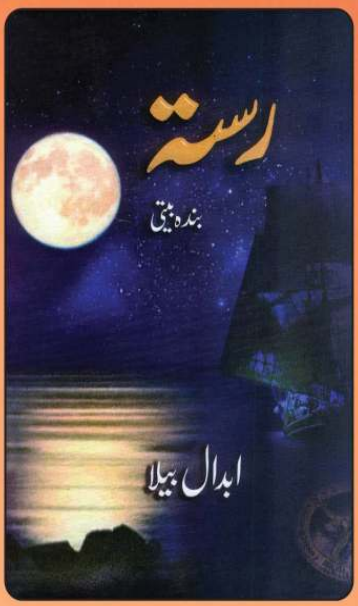
رستہ
بندہ بیتی
ابدال بیلا

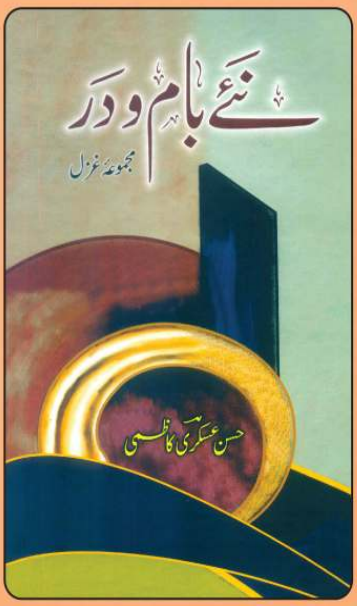
نئے بام و در
مجموعۂ غزل
حسن عسکری کاظمی

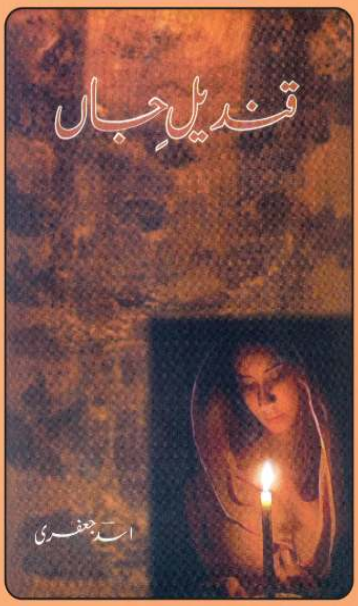
قندیلِ جاں
اسد جعفری

دستک

سرد ہوائیں
خون جلائیں
کاگ منڈیر سے اُڑ اُڑ جائیں
رستے تو ہیں نین بچھائے
پیڑ بھی ہیں
باہیں پھیلائے
سمٹ رہی ہُوں، بکھر نہ جاؤں
سوچ رہی ہوں، مُکر نہ جاؤں
سایا _____
یا _____
ہم سایا
کون آیا _____ کون آیا

خالد احمد

We support BAYAZ for its role in literary and intellectual development of our society

THE TAQ ORGANIZATION

Logistics Solutions/3PL	Freight Forwarding	Air Cargo Wholesale

We are a different organization in Pakistan

■ **Karachi:** (021) 34541301-7 ■ **Lahore:** (042) 36363300-7
■ **Sialkot:** (052) 3554301-6 ■ **Rawalpindi/Islamabad:** (051) 5162704-5
■ **Faisalabad:** (041) 8542924 ■ **Peshawar:** (091) 5606565 ■ **Multan:** (061) 4510465

Email: info@tlpk.com Website: www.taq.com.pk
UAN: +92-42-111 222 827

پاکستان میں سب سے زیادہ شائع ہونے والا ادبی جریدہ

بانی مدیر: خالد احمد

جدیدتر ادب کا شاریہ

ماہنامہ
بیاض
لاہور

ABC CERTIFIED

جلد نمبر: 30 - جنوری 2022 - شمارہ نمبر: 1

ایڈیٹر: عمران منظور

مجلس ادارت

اعجاز رضوی	نعمان منظور	نوید صادق	کنور امتیاز احمد	جاہد احمد

تزئین و آرائش: ہیثم عمران - حاذق اسد
کمپوزنگ: حافظ محمد عبداللہ

سرورق: سالِ نو مبارک
قیمت: 100 روپے

سالانہ زرِ اعانت 1000 روپے بیرونِ ملک 100$ پاکستانی روپے میں
فیصل بینک لمیٹڈ
ای ایم ای ہاؤسنگ سوسائٹی، لاہور
اکاؤنٹ نمبر: 0256007000002582

بیاض گروپ آف پبلی کیشنز

سید اطہر شہید روڈ 16 کلو میٹر ملتان روڈ لاہور-53700
فون: 3-92-42-37513000 فیکس: 92-42-37512517
Email: bayaz@trackntie.com www.trackntie.com

ویب سائٹ برائے مطالعہ
www.trackntie.com
BAYAZ

عمران منظور ایڈیٹر پبلشر اور پرنٹر نے ٹریک این ٹائی پرنٹرز 16 کلومیٹر ... سید اطہر شہید روڈ ملتان روڈ لاہور سے چھپوا کر دفتر بیاض سے شائع کیا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّاَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ

اے میرے پروردگار! مجھے اکیلا نہ چھوڑ اور تُو سب وارثوں سے بہتر ہے۔

اشاریہ

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
1	حمد	جلیل عالی ، صفدر صدیق رضی، اشرف کمال	7 تا 9
2	نعت	آصف ثاقب، سید ریاض حسین زیدی، خاور اعجاز سید فرخ رضا ترمذی، رخشندہ نوید	10 تا 14
3	عقیدت	محمد یٰسین قمر، مرزا آصف رسول	15 تا 17
4	نعتیہ رباعیات	گلزار بخاری	18
5	ہائیکو	نسیم سحر، خاور اعجاز	19 تا 20
6	افسانے	بلقیس ریاض، سیما پیروز	21 تا 39
7	آبیتی	شوکت علی شاہ	40 تا 48
8	مضامین	محمود شام، محمد ارشاد، حامد یزدانی، خورشید ربانی ہارون الرشید، شاہد اشرف، محمد حنیف، جام سجاد حسین	49 تا 109
9	غزلیں	خالد احمد، آصف ثاقب، امجد اسلام امجد، جلیل عالی حسن عسکری کاظمی، نسیم سحر، خاور اعجاز، سید ریاض حسین زیدی گلزار بخاری، باقی احمد پوری، اعجاز کنور راجہ، ممتاز اطہر خالد علیم، رشید آفرین، کرامت بخاری، راحت سرحدی حامد یزدانی، علی اصغر عباس، منظور ثاقب، ممتاز راشد لاہوری اقبال سروبہ، انصر حسن، شفیق احمد خان، حسنین سحر، ارشد شاہین محمد نوید مرزا، شہاب صفدر، تصدق شعار، اوصاف شیخ	110 تا 189

نمبر شمار	عنوان	مصنف / مصنفہ	صفحہ نمبر
9	غزلیں	افتخار شاہد، اسحاق وردگ، ذکی طارق، شوکت محمود شوکت عقیل رحمانی، زیب النساء زیبی، احمد جلیل، عزیز فیصل ارشد محمود ارشد، عمران اعوان، شاہد ماکلی، زبیر فاروق حکیم خان حکیم، عزم الحسنین عزمی، عاطف جاوید عاطف اکرم جاذب، وسیم جبران، اسد اعوان، آفتاب خان نعیم رضا بھٹی، رومانہ رومی، سرور فرحان، نائیلہ راٹھور، عاصم اعجاز خالد عدنان، عطاالعزیز، احمد محمود، سید فرخ رضا ترمذی علی حسین عابدی، طلعت شبیر، رخسانہ سمن، آسناتھ کنول رضااللہ حیدر، سہیل یار، سید ضیا حسین، جیا قریشی شہاب اللہ شہاب، سرفراز تبسم، ساجد رضا خان ازور شیرازی، بشیر احمد حبیب، شکیل قمر، اعجاز حسین فاخر محمود کیفی، عمر قیاز قائل، سید باوشاہ جلالی، اسد رضا سحر سجاد حسین ساجد، آفتاب محمود شمس، صائم شیرازی رمیض نقوی، زین علی رضوی، نوید صادق	110 تا 189
10	شاعرِ امروز	ماریہ محور، احمد رضا [شاہد ماکلی]	190 تا 194
11	طنز و مزاح / خاکہ	اعجاز رضوی	195 تا 198
12	نظمیں	امجد اسلام امجد، جمیل یوسف، گلزار بخاری، صفدر صدیق رضی خاور اعجاز، شاہدہ حسن، خالد علیم، کرامت بخاری حامد یزدانی، اسلام عظمی، فرحت عباس شاہ، ریاض ندیم نیازی طلعت شبیر، رخشندہ نوید، طالب انصاری، آسناتھ کنول، امجد بابر وکی گل، سعدیہ بشیر، مظہر حسین مظہر، نگہت اکرم نائیلہ راٹھور، حکیم خان حکیم، محمد آفتاب تابش، وسیم جبران	199 تا 228
13	خطوط	آصف ثاقب، نسیم سحر، کرامت بخاری، ممتاز راشد لاہوری آفتاب احمد ملک، طالب انصاری، اشرف کمال محمد شفیق انصاری، محمد آفتاب تابش، رانا محمد شاہد	229 تا 241

حمد

کوئی حلقہ ہے نہ حد ہے نہ کنارے اُس کے
فرش و افلاک، فضا، چاند، ستارے، اُس کے

آنکھ کے بس میں کہاں عکس اُتارے اُس کے
دلِ بینا ہی سمجھتا ہے اشارے اُس کے

نہ تو دیکھا نہ ہی سمجھا نہ اُسے پہچانا
پھر بھی موسم ہیں کئی ساتھ گزارے اُس کے

اُس کی تسبیح شماری میں بسر ہوں تو بنے
تنِ فانی کو دیے سانس اُدھارے اُس کے

وہ جو چاہے تو بِنا ابر بھی اُترے برسات
ذات ہے اُس کی عجب کام ہیں نیارے اُس کے

رحمتِ عام جہانوں کے لیے اُس کا رسولؐ
حکمتِ تام زمانوں کو سِپارے اُس کے

نخلِ توحید نمو دل میں اذاں سے پائے
روشنی فکر کو دیں نور منارے اُس کے

نا مکمل ہی رہے گا وہ بیانِ توصیف
تا ابد جو بھی دیا جائے گا بارے اُس کے

ایک اک لمحہ قیامت ہو دلوں پر عالی
گر میسر نہ ہوں امید سہارے اُس کے

جلیل عالی

حمد

حمد لکھوں گا میں ہر صفحۂ سخن سے پہلے
یوں ترا نام زباں پر ہے دہن سے پہلے

تجھ کو رکھا گیا جب کچھ بھی نہ رکھا تھا کہیں
دل بنایا گیا سینے میں بدن سے پہلے

جتنا بہتر ہوں میں اب تک تری توفیق سے ہوں
میں گنہگار تھا اس چال چلن سے پہلے

اس بلا وجہ تکلف کی ضرورت کیا تھی
میں ترے ساتھ ہی تھا دار و رسن سے پہلے

سجدہ کرتا ہوں تو احساسِ ندامت کے ساتھ
درد ہوتا ہے مرے دل میں چبھن سے پہلے

یا الٰہی مجھے اس قعرِ مذلت سے نکال
کتنی آسودہ ہوائیں تھیں گھٹن سے پہلے

صفدر صدیق رضی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو ہی حافظ ہے میرے بچوں کا
میرے شہروں کا میرے قصبوں کا

حمد

سر چھپانے کے لیے دھوپ میں گھر دیتا ہے
وہ خدا ہے جو اندھیروں کو سحر دیتا ہے

میرے بگڑے ہوئے حالات سنوارے گا ضرور
وہ جو سوکھے ہوئے پیڑوں کو ثمر دیتا ہے

میرا سرمایہ بنے حمد و ثنا کے آداب
میرا خالق مجھے لفظوں کا ہنر دیتا ہے

کس محبت سے وہ سنتا ہے دعائیں سب کی
ٹوٹے پھوٹے ہوئے لفظوں میں اثر دیتا ہے

جستجو تیری کہاں بیٹھنے دیتی ہے مجھے
تو مجھے روز نیا اذنِ سفر دیتا ہے

حوصلہ مند کو مایوس نہیں کرتا کبھی
وہ گزرنے کے لیے راہ گزر دیتا ہے

رزق دیتا ہے وہ پتھر میں بھی کیڑے کو کمال
پیٹ بھرنے کا پرندوں کو ہنر دیتا ہے

اشرف کمال

نعتؐ

نبیؐ جی آپ سے میری عقیدت
محبت درمحبت درمحبت

نبیؐ جی معجزہ شق القمر کا
حقیقت درحقیقت درحقیقت

کریں ہم ورد جب صلِ علیٰ کا
ٹلے سر سے ہمارے ہر مصیبت

یہی سرشار رکھے گا ہمیشہ
درود و ذکر کی اپنی ہے لذّت

دعا اُنؐ کی اثر دکھلا گئی ہے
مرادیں پا گئی ہے اُنؐ کی امّت

رسیلا اس قدر اُن کا کہا ہے
بہت اچھے رہیں گے نیک نیت

شفاعت ہے انہی کے دم قدم سے
انہیؐ کے واسطے سے ہے شریعت

ہم اس ایمان پر قائم ہمیشہ
دوامی ہے محمدؐ کی نبوت

شکستوں پر شکستیں کھا رہا ہے
نبیؐ کا معجزہ ، دشمن کی ذلت

عقیدہ عشق ہے ثاقب ہمارا
محمدؐ نام سے اپنی ہے نسبت

آصف ثاقب

نعتؐ

جائیں جنت کو سب قرینے سے
راستہ مل گیا مدینے سے

رازِ ہستی ہے منکشف اس پر
کھوجتا ہے جو اس دفینے سے

جو بھی آئے، وہ جھولیاں بھر لے
سب کو ملتا ہے اس خزینے سے

ماہِ میلاد کر گیا فرخ
سب مہینے ہیں اس مہینے سے

آپ کو بھول کر رہیں زندہ
موت آ جائے ایسے جینے سے

لاکھ طوفاں ہوں درپئے آزار
پار اتریں گے اس سفینے سے

جو ہے خوشبو ریاض کلیوں میں
ہے وہ سب آپؐ کے پسینے سے

سید ریاض حسین زیدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کون دلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت کے
کس کے در کا پہرہ دینے ، جاگیں چوکی دار

نعتؐ

سمندر محمدؐ ، سفینہ محمدؐ
خدا تک پہنچنے کا زینہ محمدؐ

مجھے زندگی دینے والا خدا ہے
مگر زندگی کا قرینہ محمدؐ

زمانے کی نظروں میں مکہ مدینہ
ہمارا تو مکہ مدینہ محمدؐ

درخشندہ ہے بزمِ ہستی انہیؐ سے
یہ عالم صدف اور نگینہ محمدؐ

کسی سے نہیں ایک گوشہ بھی پنہاں
جو سب پر عیاں وہ خزینہ محمدؐ

خاور اعجاز

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

قصد مدح کیے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شان خدا ، خوشبو کے کنگن ، ڈھالے گا لوہار

نعتؐ

سینے میں جو نہاں تھی محبت کی روشنی
بن کر زباں پہ آئی ہے مدحت کی روشنی

دنیا میں ہر طرف جو اجالا ہے نور کا
یہ نورِ حق ہے شمعِ رسالت کی روشنی

تفریقِ رنگ و نسل مٹائی حضور نے
ہر سمت اب فروزاں ہے وحدت کی روشنی

وہ کامیاب ہے جسے محشر میں مل گئی
سرکارِ دو جہاں کی قیادت کی روشنی

ختم الرسل ہے اب نہ نبی کوئی آئے گا
دنیا میں اب ہے ختمِ نبوت کی روشنی

جو عشقِ مصطفیٰ کے جلاتا رہا چراغ
محشر میں پائے گا وہ شفاعت کی روشنی

کہتا ہوں نعت اس لیے ہر روز میں رضا
نعتِ نبی سے ملتی ہے حکمت کی روشنی

سید فرخ رضا ترمذی

نعتؐ

اندھیروں میں جگنو سمیٹے کھڑی ہوں
کرم اُن کے ہر سو سمیٹے کھڑی ہوں

کھڑی ہوں میں روضے کی جالی سے لگ کر
میں خوشبو ہی خوشبو سمیٹے کھڑی ہوں

منور کروں گی سلاموں کے سورج
میں انوار ''یاہو'' سمیٹے کھڑی ہوں

وہ جن سے ہو زیر و زبر دل کی دنیا
وہ لفظوں کے جادو سمیٹے کھڑی ہوں

کہاں میرے اعمال پلکیں اٹھاؤں
میں عاصی ہوں پہلو سمیٹے کھڑی ہوں

بہاؤں گی طیبہ کی گلیوں میں جاکر
میں رخشندہ آنسو سمیٹے کھڑی ہوں

رخشندہ نوید

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

لکھتے ہی اُنؐ کا اسم مبیںؐ جھلملا اُٹھیں
عرشِ ورق پہ کاہ کشانِ سخن تمام

نعتؐ [مسدس حالی پر تضمین]

انوکھی ، نرالی وہ چھب پانے والا — وہ عالم میں اعلیٰ حسب پانے والا
مزکّی ، مجلّی ، نسب پانے والا — ورائے گماں سب کا سب پانے والا
مراتب جہاں میں عجب پانے والا
وہ نبیوں میں رحمت لقب پانے والا

شعور آگہی کے گہر لانے والا — خلا و ملا کی خبر لانے والا
شبِ زندگی کی سحر لانے والا — نصاب کمال بشر لانے والا
سخا و عطا اوج پر لانے والا
مرادیں غریبوں کی بر لانے والا

جلو میں لئے رشدِ تام آنے والا — جہاں میں بصد احتشام آنے والا
نبوّت کی بن کر ختام آنے والا — رسولوں کا ہو کر امام آنے والا
بشارت لئے گام گام آنے والا
مصیبت میں غیروں کے کام آنے والا

ہدایت کا رستہ وہ دکھلانے والا — وہ وحدت کے اسرار سمجھانے والا
وہ پیغام حق سب کو پہنچانے والا — کتاب اور حکمت کا سکھلانے والا
جہالت سے آزاد فرمانے والا
وہ اپنے پرائے کا غم کھانے والا

وہ مہر و مروّت کا اک ٹھنڈا جھونکا — سخاوت ، عنایت کا مؤاج دریا
رؤفؐ و رحیمؐ اور شفقت سراپا — ''حریص علیکم'' اسی کو ہے زیبا
خدا کی خدائی کا ہمدرد سچّا
فقیروں کا ملجا ، ضعیفوں کا ماویٰ

خبرگیری ہر اک کی جس کا ہے خاصا — نہیں دکھ کسی کا بھی جس کو گوارا
ہے جس کی عطاؤں کا عالم میں چرچا — جو دنیا و عقبیٰ میں حامی ہے سب کا
وہ رحمت ، مودّت ، شفاعت کی برکھا
یتیموں کا والی غلاموں کا مولیٰ

وہ انسان کو معتبر کرنے والا وہ مجبور کو چارہ گر کرنے والا
فقیروں کو وہ تاجور کرنے والا مدارات شام و سحر کرنے والا
کرم اکثر و بیشتر کرنے والا
خطاکار سے درگزر کرنے والا

غمِ زندگی مختصر کرنے والا منوّر دلوں کے نگر کرنے والا
وہ تکریمِ نوعِ بشر کرنے والا مساوات کو راہبر کرنے والا
وہ لطف و عطا سر بسر کرنے والا
بداندیش کے دل میں گھر کرنے والا

خیالوں کی دنیائیں سر کرنے والا دلوں کی زمیں سبز و تر کرنے والا
وہ ترویجِ علم و ہنر کرنے والا حقیقت سے وہ باخبر کرنے والا
تعصّب، جفا بے اثر کرنے والا
مفاسد کا زیر و زبر کرنے والا

طلب سے عطا بیشتر کرنے والا محبت کو پیغامبر کرنے والا
خیالوں کو پاکیزہ تر کرنے والا وہ نخلِ وفا بارور کرنے والا
وہ اصلاحِ قلب ونظر کرنے والا
قبائل کو شیر و شکر کرنے والا

رویّہ ہے جس کا جہاں بھر میں یکتا کریمانہ اخلاق کا اک حوالا
نویدِ خلیلؑ و کلیمؑ و مسیحاؑ وہ یٰسین و طٰہٰ ، وہ قرآں سراپا
اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

محمد یٰسین قمر

شہِ خوباں!

یہ دل جو عشق کا بھرتا ہے دم، ہے تجھ پہ فدا
ہو اِس پہ اور بھی لطف و کرم، ہے تجھ پہ فدا

وہ دل جو آپ کوئی پل بھی ذمہ دار نہیں
وہ کس پہ ڈال کے بارِ ذِمم؟ ہے تجھ پہ فدا

تری ثنا نے بھی دی ہے ترے عدو کو شکست
وہ مدح جس سے کہ غارت ہو ذم، ہے تجھ پہ فدا

ہے تو وہ سیدِ کونین اے شہِ خوباں!
عرب نثار ہے تجھ پر، عجم ہے تجھ پہ فدا

ہے تو وہ عزتِ حق، تو وہ حُجتِ یزداں
کہ ہر رسول، رسولِ اُمم! ہے تجھ پہ فدا

وہ جس نے دی تھی بشارت کہ "اِسمہٗ اَحمد"
"نَفَختُ فِیہِ" سے لے کے جنم، ہے تجھ پہ فدا

کہیں خلیفہ ہے آدم تو اس سے بھی پہلے
جہاں تلک ہے قلم و قلم ہے تجھ پہ فدا

جہادِ زیست میں ہے جیت بس رضا تیری
اگر کچھ اور بھی ہے مغتنم، ہے تجھ پہ فدا

مرزا آصف رسول

نعتیہ رباعیات

گلزار بخاری

اخلاق محمدؐ ہے خزانہ سارا
کنبہ ہے فضائل میں یگانہ سارا
تنویر ہے اول سے وہی آخر تک
ہے نور علیٰ نور گھرانہ سارا

.....

پاکیزہ گلِ سید لولاک رکھے
عصمت سے پرے رجس کے خاشاک رکھے
تطہیر کی حق دار ہوئی آلِ نبی
اللہ نے چاہا کہ اسے پاک رکھے

.....

جس ذات کا سورج نہ ستارا ہے شریک
گہسار سمندر ہے نہ دھارا ہے شریک
گلزارؔ درود ایسی عبادت دیکھی
اس ورد میں خالق بھی ہمارا ہے شریک

.....

گر دل میں نہ ہو عشقِ محمدؐ کا ورود
کس کام کے ٹھہریں گے رکوع اور سجود
گلزار پڑھو تم بھی فرشتوں کی طرح
اللہ بھی پڑھتا ہے محمدؐ پہ درود

.....

ہر باب فضیلت میں وہ اکمل ٹھہرے
کردار میں گفتار میں افضل ٹھہرے
کہتا ہے یہی ماہ ربیع الاوّل
آخر میں بھی آ کر وہی اوّل ٹھہرے

ہائیکو (جاپانی ہائیکو نگار یوشی میکامی اِسا کے ہائیکوز کا ترجمہ)

A man, just one...
Also a fly, just one..
In the huge drawing room

تنہائی کا راج
اتنے کشادہ کمرے میں
میں اور اِک مکھی!

O snail
Climb Mount Fuji
But slowly, slowly !

رینگتے کیڑے، تُو
کوہِ فُجی پر چڑھ تو سہی
لیکن۔۔۔آہستہ!

نسیمِ سحر

Napping at midday
I hear the song of rice planters
and feel ashamed of myself
Kobayashi Issa

خود پر شرمندہ!
دھوپ میں محنت کش مصروف
اونگھ رہا ہوں مَیں

(Jane Reichhold)

Wild flowers

The early spring sunshine

In my hand

کچھ جنگلی غنچے
اوّل موسمِ گل کی دھوپ
میرے ہاتھوں میں

The whole sky

In a wide field of flowers

One Tulip

بامِ فلک ہے یا
پھولوں کے باغیچے میں
ایک گلِ لالہ

A long journey

Some cherry petals

Begin to fall

ایک طویل سفر
چیری کی کچھ پنکھڑیاں
گرنے کا آغاز

Winter cold

Finding on a beach

An open knife

یخ بستہ سردی
ڈھونڈ رہی ہے ساحل پر
ایک کھلا چاقو

خاور اعجاز

پھولوں کی تازہ مہک

بلقیس ریاض

فیصل نے اپنا آخری فیصلہ سناتے ہوئے ماں سے کہا۔

''امی... ہرگز اوپر کا پورشن کرائے پر نہیں دوں گا۔ اللہ کے فضل سے میری تنخواہ میں گھر کا گزارہ بخوبی چل رہا ہے... کرائے داروں کی روز روز چخ چخ بک بک ہرگز برداشت نہیں کرسکتا... کبھی فلش خراب ہوگیا ہے... تو ٹھیک کرواؤ... کچھ اور ٹوٹ پھوٹ ہوتی ہے تو وہ بھی درست کروائیں۔

رابعہ بیگم نے بیٹے سے کہا۔

عدیل... تمہارا دوست آیا تھا... اور شریف گھرانے کے لوگوں کے لیے میری منت سماجت کر رہا تھا... وہ اپنا مکان بنانے والے ہیں... جلد ہی خالی کر دیں گے... ساری مین ہیٹن نس ان کے ذمے ہوگی۔ اتنا بڑا گھر ہے... تم تو دفتر چلے جاتے ہو... اس گھر میں سناٹا چھا جاتا ہے... اوپر کرائے دار آجائیں گے تو گھر میں چہل پہل شروع ہوجائے گی۔

فیصل نے سوچتے ہوئے پوچھا۔

کتنے لوگ ہیں۔

صرف ماں بیٹی ہے۔

''آپ کو کیسے پتہ ہے''۔

عدیل ان کو لیکر آیا تھا... بیچاری زمانے کی

ستائی ہوئی لگ رہی تھی- کیا بتاؤں... فیصل... بچی کیا تھی ایک کنول کا پھول باپ فوت ہو چکا ہے- چچا نے ساری جائیداد ہڑپ کر لی ہے اور اپنے بیٹے کے ساتھ اس کی شادی کرنا چاہتے ہیں-

ایک ہی گھر میں رہنا ان کے لیے مشکل ہو گیا ہے... تھوڑا سا اثاثہ ان کے پاس ہے اپنا الگ مکان بنوا رہی ہیں-

''امی... عدیل تھوڑی سی دیر کے لیے ان کو لیکر آیا تھا اور آپ نے پوری داستان سنا دی ہے- ایسے لوگ کرایہ نہیں دیتے بلکہ مفت رہنا پسند کرتے ہیں... بڑی اچھی طرح سے سوچ سمجھ لیں''-

''بیٹا ان کو دیکھ کر میرا دل کچھ رضا مند ہو گیا تھا... پھول جیسی بچی... اگر کرایہ پر مکان نہ دیا تو در بدر کی ٹھوکریں کھائیں گی... جو تھوڑا بہت اثاثہ ہے وہ بھی دیور نے ہڑپ کر لینا ہے اور زبردستی اپنے بیٹے سے شادی بھی کر دینی ہے- ماں کی خواہش دیکھ کر فیصل نے ہتھیار پھینک دیے اور اوپر کی صفائی کروائی گئی- رابعہ بیگم انجانے میں ماں بیٹی کو ملکر بہت مطمئن ہو گئی تھی اور عدیل کے ذریعے کرائے داروں کو بلوا کر... فیصل کی بات چیت کروائی- مہک اپنی ماں کے ساتھ دھیرے دھیرے ہر بات کا جواب دے رہی تھی-

فیصل نے ابھی تک مہک کی جانب غور سے دیکھا ہی نہیں تھا- اس کی والدہ بار بار فیصل کو کہہ رہی تھی- عدیل اور اس کی والدہ سے میرے گہرے مراسم ہیں- ہمارے بارے میں وہ آپ لوگوں کو بتا دے گا-

فیصل نے اپنے سامنے بیٹھی نجمہ بیگم کو دیکھا بھاری بھر کم اچھی شکل و صورت کی دکھائی دے رہی تھیں... پھر یک دم اس کی نگاہیں مہک پر اٹھ گئیں- بہار کے موسم کی کھلی کلی ...شگفتہ نرم و نازک... فیصل کچھ اور پوچھ ہی نہ سکا اور اپنی ساری توجہ اپنی ماں کے چہرے پر مرکوز کرتے ہوئے حامی بھر دی-

اس طرح نجمہ اور مہک اوپر کے پورشن میں شفٹ ہو گئیں... مہک تیار ہو کر نیچے آئی تو فیصل دفتر جانے کے لیے پورچ میں آیا اور گاڑی میں بیٹھنے ہی والا تھا کہ۔

دھیمی سی آواز ابھری-

السلام علیکم-

فیصل نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو مہک اس کو سلام کر رہی تھی-

وعلیکم السلام-

اور... وہ اس کو دیکھتا ہی رہ گیا... اکثر اس کے تصور میں ایک خوبصورت لڑکی کا گلابی دمکتا ہوا چہرہ آ جاتا لمبے بال... نشیلی آنکھیں... ایسی مدبھری آنکھیں... جو اپنی گرفت میں لے لیتی تھیں مگر اس کے نازک ہونٹ ...سل سے گئے... بغیر اسکی جانب دیکھے وہ جلدی سے گاڑی میں بیٹھ کر

دفتر چلا گیا...وہ پہلی ملاقات میں اس سے فری نہیں ہونا چاہتا تھا...اور سوچنے لگا کہ شاید وہ اس سے لفٹ مانگنا چاہتی تھی...کچھ کہنا چاہتی تھی...اس کے دماغ میں ہلچل سی مچ اٹھی...اس نے سوچا۔

”خوامخواہ امی نے ان کو مکان کرائے پر دے دیا اچھا بھلا آزادی سے گھوم پھر رہا تھا...ابھی تو سو طرح کے پرابلم ان کے سامنے آنے تھے...پھر اس کی آنکھیں یاد آ گئیں جہاں کئی کہانیاں چھپی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھیں اتنی روشن تھیں کہ ہر چیز کو حیرت سے دیکھ رہی تھی...بس ایک نظر ڈال کر ہی اس کے بارے میں سب کچھ اخذ کر لیا تھا اور لب سلام کرنے کے بعد سلے ہوئے تھے...اس کے چہرے میں اتنی جاذبیت تھی۔ اس نے سوچا۔

”کیا مصیبت ہے...نہ جانے کون لوگ ہیں...مکان کرائے پر دینے کی جلدی تو نہیں کی...پھر عدیل پر غصہ آنے لگا۔ اس کو کہا بھی تھا کہ مکان کرائے پر نہیں دوں گا۔ مگر اس نے مجھ سے پوچھے بغیر ہی ان ماں بیٹی کو امی سے ملا دیا ہے...امی نے اپنی مرضی سے اسلام آباد میں اپنی سہیلی کے گھر میری منگنی کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ میں نے زندگی میں ایک بار دیکھا ہے۔ امی کی پسند ہے...ٹھیک ہی ہو گی ہے...اور جب عاشی بیاہ کر آئے گی تو اس نے اس لڑکی کو برداشت نہیں کرنا۔ پھر کیا ہو گا... عاشی تو ابھی آئی نہیں ہے...یہ لڑکی اگر لفٹ بھی مانگے گی تو اسے نہیں دوں گا...بلکہ کوئی رابطہ بھی نہیں رکھوں گا...اور پھر وہ اپنے کام میں جت گیا۔

اندھیرا...بھیگی ہوائیں...مدھر موسیقی بکھیر رہی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے نیچے آئی...اور اس کے پیچھے اسکی والدہ نجمہ بیگم...پورچ تک آئیں اور ٹیکسی کا انتظار کرنے لگیں...اور پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ٹیکسی آ گئی اور وہ دونوں سوار ہو گئیں۔

رابعہ بیگم تیار ہو کر فیصل کے ساتھ اس کے دوست کے گھر جا رہی تھیں۔ بہت اصرار سے عدیل نے ان لوگوں کو کھانے پر مدعو کیا تھا۔ رابعہ بیگم نے فیصل سے کہا۔

بیٹا ان لوگوں کو بھی رائیڈ دے دیتے... پڑوسیوں کے بڑے حقوق ہیں۔

”توبہ امی میں نہ کہتا تھا کہ...مکان کرایہ پر نہ دیں...مگر آپ نے ایک نہ سنی...اب رائیڈ کے لیے ان کی عادت نہ ڈالیں...اوبر (Uber) ٹیکسی کا بہت آرام ہے...آپ غم نہ کریں...اللہ بہتر کرے گا“۔

”فیصل“

”جی امی“

فیصل گاڑی چلاتے ہوئے گویا ہوا۔

''اسلام آباد سے فون آ رہے ہیں...کیا جواب دوں''

''ابھی تھوڑا انتظار کریں...رشتے ناطے بغیر دیکھے بھالے نہیں کیے جاتے...ان کے ساتھ گہرا رابطہ رکھنا پڑتا ہے...یہ تو منگنی نہ کرنے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہو... ہمارے معاشرے میں شریف لوگ کہاں بیٹیوں کو چھوٹ دیتے ہیں کہ وہ منگیتر سے تعلق بڑھا کر کردار کے بارے میں چھان بین کرے''۔

''امی...سب کچھ آسان ہو جائے گا... جہاں قسمت لکھی ہے...وہاں رشتہ بھی ہو جائے گا''۔

دونوں باتیں کر رہے تھے...اور دس منٹ کی ڈرائیو پر عدیل کا گھر آ گیا تھا۔

وہ اندر داخل ہوئیں تو مہمانوں کے جھرمٹ میں نجمہ بیگم اور مہک کو دیکھا...رابعہ بیگم عدیل کی ماں سے ملکران کے پاس بیٹھتے ہوئے...گویا ہوئیں۔

''ارے...آپ نے یہاں کھانے پر آنا تھا تو ہم اکٹھے ہی آ جاتے''۔

''چلو بہن...ٹیکسی پر بھی آرام سے آئے ہیں...اگلی مرتبہ اکٹھے آ جائیں گے۔ فیصل عدیل سے بات چیت میں مصروف تھا اور کچھ فاصلے پر مہک بیٹھی ہوئی کن انکھیوں سے فیصل کو دیکھ رہی تھی اور فیصل ایک لڑکی کو اپنے ساتھ تصور ہی تصور میں اپنے ارد گرد منڈلاتے دیکھتا تھا۔ وہ...انجانے میں اس کے سائے کے پیچھے بھاگتا تھا...وہ ...شاید...یہی لڑکی ہے...مہک ہے۔ سارے کمرے میں اس کے وجود سے اٹھتی ہوئی خوشبوئیں پھیل گئیں۔ وہ اچانک اس کی زندگی میں داخل ہوئی''۔

تذبذب کی دلدل میں اپنے آپ کو نکالنے کی کوشش کر رہا تھا۔ مہمان گرامی...ٹولیوں کی صورت میں ایک دوسرے کے ساتھ خوش گپیوں میں مصروف تھے... پھر نہ چاہتے ہی اس نے مہک کی جانب دیکھا... اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ شاداب اور کھلا کھلا...وہ کسی بات پر ہنسی تو یوں دکھائی دیا کہ اس کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہوں... عدیل نے اس کی کیفیت کو دیکھا اور پوچھا...وہ چونک پڑا۔

''کب ہو رہی ہے...منگنی''۔

ابھی کچھ سوچا نہیں...پھر بغیر دیکھے منگنی کیسے کر لوں۔

''لیکن آنٹی کی خواہش ہے...کہ جلدی سے تمہاری شادی ہو جائے اور گھر میں رونق لگ جائے''۔

''رونق تو تب لگے گی کہ ہماری انڈر سٹینڈنگ ہو... میں ارینج میرج (Arrange marriage) کے خلاف ہوں...لڑکیوں کے بارے میں معلوم نہیں ہوتا...ان کے دماغوں میں کیا

چل رہا ہے… عاشی سے بات چیت کر کے ہی شادی کروں گا"۔

عدیل نے فیصل سے کہا۔

"یقین مانو یہ بالکل تمہارے مزاج کی ہے… کھلے ذہن کی ہے"

"یہ لڑکی بہت اچھی ہے… مگر"

"مگر کیا"

فیصل نے جلدی سے پوچھا۔

"بھئی کوئی خاص اثاثہ نہیں ان کے پاس… بس علم کا خزانہ ہے اور خاندانی لوگ ہیں"۔

"پھر تم نے کیوں نہیں کی"۔

دراصل امی نے میری منگنی خالہ کی بیٹی سے کر دی تھی… اور میں منسوب تھا… مہک کے بارے میں ہر وقت پریشان رہتی ہیں۔ وہ اچھی لڑکی ہے… اور اس کے لیے اس کا ہونے والا شوہر بہت ہی لائق فائق ہونا چاہیے۔

"تو مہک تمہاری رشتہ دار ہے"۔

"نہیں… امی کی پرانی سہیلی کی بیٹی ہے"۔

"اوہ"

"پھر کیا سوچا ہے"۔

شادی ایسے تھوڑی ہوتی ہے… تم نے کہا اور میں نے حامی بھر لی… اس کو پرکھوں گا کہ قابل ہے بھی کہ نہیں۔

وہ تو تمہاری بات ٹھیک ہے… مگر بغیر جہیز کے شادی۔

"اچھا ــــ اس ٹوپک کو چھوڑو"۔

دیکھا تم بھی سٹیٹس اور مالدار لڑکی سے شادی کرنا چاہتے ہو۔ فیصل اس وقت کسی اور ہی سوچ میں تھا۔ وہ خاموش رہا اور کھانے کے اختتام پر وہ مہک اور اس کی والدہ نجمہ بیگم کو بھی گاڑی میں بیٹھنے کیلئے اصرار کرنے لگا۔

گھر پہنچ کر رابعہ بیگم نے کہا۔

"مہک بہت اچھی لڑکی ہے… اس کی ماں بھی مجھے بہت اچھی لگی ہے… لیکن ان کے پاس شادی کرنے کے لیے کوئی سرمایہ نہیں ہے۔ اگر شادی کے لیے ہم راضی ہو جائیں تو رشتہ داروں اور سہیلی کو کیا جواب دیں گے… وہ کیا سوچیں گے… متوسط گھرانے کی لڑکی سے شادی کر بیٹھے… اتنا ہونہار بیٹا ہے ان کا"۔ــــ؟

"امی… ایک دم آپ کا ارادہ بدل گیا ہے… سہیلی تو ناراض ہو جائے گی… یہ سوچ لیں"۔

آپ نے تو اسلام آباد شادی کرنے کا سوچا ہے۔

"ابھی میں نے کونسا رشتہ مانگ لیا ہے یہ لوگ چھ ماہ تک ہمارے گھر ہی رہیں گے اس عرصے میں میں چھان بین کر لوں گی۔ ایک لحاظ سے چھوٹی سی فیملی ہے… اور غرض مند ہیں۔ لڑکی دب کر رہے گی۔

"مگر آپ تو امیر بہو چاہتی تھیں"۔

ارادہ تو تھا… کیونکہ اپنے برابر والوں سے رشتہ خوب جچتا ہے۔

"لیکن… یہ تو برابر والے نہیں ہیں"۔

بیٹا اللہ مالک ہے... روز نماز کے بعد تمہارے لئے نیک اور صالحہ لڑکی مانگتی ہوں۔ قدرت نے گھر بیٹھے ہی لڑکی کو بھیج دیا ہے... فیصل ماں کی باتیں سن رہا تھا... دل کے کسی کونے میں مہک کی خوشبو سے لطف اندوز ہو رہا تھا... مہک نے تو ایک جھلک میں ہی اس کو اپنا گرویدہ کرلیا تھا۔

اور رابعہ بیگم نے بیٹے سے کہا۔

لیکن... مہک تو دل ہی دل میں میری بہو کا روپ دھار چکی ہے... عدیل کی ماں نے خوب ان لوگوں کی تعریفیں کی ہیں... اور تمہیں پرکھنے کا موقع بھی مل گیا ہے... میرا گھر بھرا ہوا ہے تمہارے باپ نے ماشاءاللہ اتنا چھوڑا ہے کہ ہم آرام سے زندگی گزار سکتے ہیں۔ فیصل ماں کی باتوں پر غور کرنے لگا۔

دوسری صبح مہک دفتر جانے کے لیے پورچ میں آئی تو فیصل نے کہا۔

چلیں میں آپ کو دفتر چھوڑ دیتا ہوں۔

''شکریہ'' اوبر ٹیکسی آرہی ہے۔

''کیوں میرے ساتھ جانا پسند نہیں کریں گی''۔

''نہیں ایسی کوئی بات نہیں ہے'' فیصل نے کہا۔

چوکیدار روپے اس کو دے دے گا... اگلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اس کو بیٹھنے کیلئے کہا۔

''وہ چپ چاپ بیٹھ گئی''

دس منٹ کے بعد اس کا دفتر آنا تھا... فیصل کو موقعہ مل گیا اس سے بات چیت کرنے کا... اور اس کے خیالات جانچنے کا---

آپ نے گھر کیوں شفٹ کیا۔

بس مجبوری کے تحت... سب لوگ اکٹھے ہی رہتے تھے... میرے چچا کے ساتھ امی کی تکرار رہنے لگی۔ وہ ابا کی جائیداد سے حصہ مانگتے تھے... بلکہ کافی سرمایہ لے چکے تھے... امی برداشت نہیں کرسکیں اور علیحدہ گھر بنانے کا فیصلہ کردیا... مکان ابھی پوری طرح بنا نہیں ہے... اسلئے ہم نے آپ کا گھر کرایہ پر لے لیا ہے۔ چند مہینوں کے بعد گھر بن جائے گا تو ہم وہاں شفٹ ہوجائیں گے۔ عدیل بھائی بتا رہے تھے آپ کرایہ داروں کو رکھنے کے حق میں نہیں تھے... مگر آپ نے بہت بڑا احسان کیا ہے... ہمیشہ یاد رہے گا۔

مہک... باتیں کرتے کرتے آبدیدہ ہوگئی... تو فیصل کا دل پسیج گیا... اور جان گیا عدیل سچ کہتا ہے خاندانی اور شریف لوگ ہیں۔

ایک بلڈنگ کے آگے گاڑی رک گئی... تو فیصل نے پوچھا۔

یہاں آپ کام کرتی ہیں... یہ تو بہت بڑی فرم ہے... یہاں پر بہت کوالیفائیڈ لوگوں کو ملازمت ملتی ہے۔

''جی''

آپ نے کہاں تک پڑھا ہے؟

جی میں نے لندن سکول آف اکنامکس سے

بزنس ایڈمنسٹریشن سے ماسٹرز کیے تھے...
تب میرے والد حیات تھے۔
آپ وہاں کی پڑھی ہیں؟
"جی"
فیصل حیران سا اس کی جانب دیکھنے لگا...
اس کا معصوم چہرہ اور ہر بناوٹ سے پاک تھا... وہ گاڑی سے اتری اور اپنا بیگ کندھے پر ڈالا اور فیصل کا شکریہ ادا کیا۔
وہ جانے لگی تو فیصل نے کہا۔
"آپ کتنے بجے آف ہوں گی... کیا لینے کیلئے آجاؤں"
بہت شکریہ فرم کی طرف سے واپسی آرام سے ہو جاتی ہے۔
فیصل نے اسے جاتے ہوئے دیکھا... اور واپسی پر سوچنے لگا... میں نے تو کبھی سوچا نہیں تھا کہ یہ لڑکی میری زندگی میں دستک دے گی۔
نجمہ بیگم نے بہت اصرار سے فیصل اور رابعہ بیگم کو کھانے پر بلایا اور دونوں ہی جب اوپر پہنچے تو گھر کا نقشہ ہی بدلا ہوا تھا... نہ صرف گھر کی سجاوٹ اچھی تھی بلکہ کھانا بھی بہت عمدہ تھا۔ وہ بتا رہی تھیں یہ کھانا مہک نے بنایا ہے... لندن کی تعلیم کے دوران اس نے یہ کھانا بنانا سیکھا ہے... نجمہ بیگم کو فیصل کافی حد تک پسند آگیا تھا... وہ بیٹی کی ماں تھیں کیسے ان لوگوں کو کہتی۔
وقت گزرتا گیا اور ان کا گھر پایہ تکمیل تک پہنچ گیا اور وہ لوگ اپنے گھر میں شفٹ ہونے سے پہلے... رابعہ بیگم اور فیصل کا شکریہ ادا کر رہی تھیں... اور جاتے وقت مہک نے فیصل کی جانب دیکھا تو وہ کچھ کہنا چاہتا تھا... مگر... الفاظ اس کے لبوں سے ادا نہ ہو سکے۔
اور وہ خاموشی سے اپنے گھر شفٹ ہو گئی۔
اسلام آباد سے سہیلی کے فون پر فون آرہے تھے... اور وہ کہہ رہی تھیں بہت سے رشتے عاشی کیلئے آرہے ہیں... مگر میں نے سوچا ہے ہم لوگوں کا سٹیٹس ایک جیسا ہے... رشتے برابر والوں سے ہی کیے جاتے ہیں... میں نے تو نئے ماڈل کی کار بھی فیصل کے لیے خرید لی ہے... اور شادی کے وقت گھر کی رجسٹری بھی دے دوں گی۔ رابعہ بیگم خاموش ہو گئیں اور فیصل کے دل میں مہک کے لیے بے لوث چاہت شمع کی مانند جل رہی تھی... جس کی روشنی کو اس نے محسوس کیا تھا... وہ روشنی مدھم ہوتی گئی اور پھولوں کی تر و تازہ مہک دل میں اترنے لگی... جہاں پھولوں کے سایہ دار درخت تھے... پھول ہی پھول چار سو دکھائی دے رہے تھے... اور سوچ رہا تھا۔ انسان کی زندگی کی کہانی اللہ نے خود لکھی ہے... جوڑے تو آسمانوں پر بنتے ہیں... اور رابعہ بیگم اپنی سہیلی کو رشتے کے لیے حامی بھر چکی تھیں۔

☆☆☆☆☆

''زبیدہ لاج''

برسوں بعد آج وہ سب زبیدہ لاج میں اکٹھے ہوئے تھے۔ ناشتے کی میز پر اس نے نظر دوڑائی ماشاء اللہ سب کرسیاں بھری ہوئی تھیں۔ بلکہ کچھ لوگ ادھر ادھر کھڑے بھی تھے۔ یہاں وہاں اُن لوگوں کے بچے ان کا مستقبل بھرا ہوا تھا، مگر ماضی وہ تو کہیں بھی نہیں تھا۔ دور کہیں بہت پیچھے وقت کی گرد میں کھو گیا تھا۔ اس نے چشم تصور سے دیکھا وہاں میز کے کنارے والی کرسی پر ابا جی بیٹھا کرتے تھے۔ لمبے چوڑے، سرخ و سفید چہرے پر گھنی مونچھیں۔ شاید مونچھوں کی وجہ سے ان کی شخصیت بڑی بارعب لگا کرتی تھی۔ پولیس کی وردی اُن پر کتنی سجتی تھی۔ ان کی ساتھ والی کرسی پر اماں اور پھر وہ چھ بہن بھائی۔ ابا جی وقت کے بہت پابند تھے۔ اس لیے سردیاں گرمیاں صبح ساڑھے سات بجے ناشتے کی میز پر موجود ہوتے۔ اسی طرح رات کا کھانا پورے آٹھ بجے کریمن بوا میز پر لگا دیتی تھیں۔ چھٹی والے دن اُن لوگوں کا کیسا جی چاہا کرتا تھا کہ وہ دیر تک سوتے رہیں، مگر ابا جی کے خوف کے مارے وقت پر پٹ سے آنکھ یوں کھل جاتی جیسے کسی نے جھنجھوڑ کر جگا دیا ہو۔ حالانکہ ابا جی نے آج تک بچوں کو نہ ڈانٹا تھا نہ کبھی مارا پیٹا تھا۔

سیما پیروز

شاید پولیس کی ملازمت کی وجہ سے ان کے مزاج میں تھوڑی سختی تھی۔ ورنہ وہ ملازموں تک کو نہیں ڈانٹتے تھے۔ البتہ اگر گھر میں کبھی کوئی بھولے سے کسی مقدمے کی سفارش یا رشوت کے طور پر کچھ لے کر آجاتا تو پھر ان کا غصہ دیکھنے والا ہوتا۔ اس وقت سب ڈر کے مارے کانپ رہے ہوتے۔ اور سب بہن بھائی کونے کھدروں میں چھپتے پھرتے۔ ایسے میں اماں ان سب کو اپنے گرد ایسے اکٹھا کر لیتیں، جیسے مرغی خطرے کے وقت اپنے چوزوں کو اپنے پروں کے نیچے چھپا لیتی ہے۔

اماں بڑے دھیمے لہجے میں انھیں سمجھاتیں "دیکھو تمھارے ابا جس پر غصہ ہو رہے ہیں۔ وہ انھیں رشوت دے رہا تھا۔ آپ کو معلوم ہے نہ رشوت لینا اور دینا گناہ ہے۔"

"آہ پیاری اماں! ان کی یاد سے اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ وہ تو سچ مچ کی جنت تھیں ٹھنڈی میٹھی چھاؤں والا گھنا درخت جس کی چھتر چھایا میں کتنی شانتی اور سکھ تھا۔ اپنی ساری اولاد کو فرداً فرداً ان کے مزاج کے مطابق برتنے اور سمجھنے والی۔

"ہائے کہاں گئے وہ دن اور وہ پیارے پیارے لوگ۔"

صبح دم آنکھ کھلتی تو اماں سفید دوپٹے کی بُکل مارے اُن سب بہن بھائیوں پر نماز کے بعد دم پڑھ کر پھونک رہی ہوتیں اور بڑے بھائیوں کو نماز کے لیے کتنے پیار سے جگا رہی ہوتیں۔

اکثر ایسا ہوتا کہ اماں نماز کے بعد تلاوت کر رہی ہوتیں اور صدف ان کی گود میں لیٹ جاتی۔ وہ تلاوت بھی کرتی جاتیں اور صدف کے سر اور چہرے پر ہاتھ بھی پھیرتی جاتیں کیا سرور ملتا تھا اور ایسی میٹھی غنودگی چھا جاتی کہ وہ جانے کن جہانوں کی سیر کو نکل جاتی۔ مدہوشی اس وقت ٹوٹتی جب اماں تلاوت ختم کر چکتیں

"آئے ہائے___" سو گئی۔ اب اٹھ جاؤ میری ٹانگ بالکل شل ہو گئی ہے۔ اتنی بڑی لوتھا ہو گئی ہو۔ پر بچپنا ابھی تک نہیں گیا۔

وہ اُٹھنے کے بجائے اور زیادہ اماں سے لپٹ جاتی۔ اپنے دونوں بازو ان کی کمر کے گرد حمائل کر کے اور زیادہ ان کی گود میں گھس جاتی۔

کیسی پیاری اور سوندھی سوندھی خوشبو آتی تھی اماں کے بدن سے۔

"اماں! کون سا پرفیوم استعمال کرتی ہیں آپ___؟ صدف لمبا سانس بھر کے خوشبو سونگھتی

"پاگل___ صبح صبح میں نے کون سا پرفیوم لگانا ہے۔"

ابا کے ساتھ وہ لوگ جا بجا گھومتے رہتے تھے۔ دو تین سال سے زیادہ کبھی ایک جگہ پر ٹکتے ہی نہیں تھے۔ ہر ٹرانسفر پر اماں سخت بیزار ہوتیں۔ "لو اب پھر سامان باندھو اور چل پڑو۔ عجب خانہ بدوشوں والی زندگی ہے۔ جہاں ذرا دل لگنے لگا ہے وہاں سے

کوچ کا حکم مل جاتا ہے۔"
"نوکری جو ہوئی۔ میں کون سا خوشی سے دھکے کھاتا پھرتا ہوں۔" ابا خفا سے ہو جاتے۔
"بچوں کی پڑھائی کا کتنا ہرج ہوتا ہے۔ آپ کی ٹرانسفر بھی تو ایک سے ایک پس ماندہ ضلعوں میں ہوتی ہے۔ آپ کے کئی کولیگ بڑے بڑے شہروں میں مزے سے بیٹھے ہوئے ہیں۔ وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتے۔ انہیں کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں۔؟"
زبیدہ بیگم تم بھی جانتی ہو۔ نہ میں رشوت خور ہوں نہ افسروں کی چاپلوسی کرتا ہوں۔ میرے جیسے بندے اسی طرح شٹل کاک بنے رہتے ہیں۔ مجھے کوئی پچھتاوا نہیں ہے۔ میرا ضمیر مطمئن ہے۔ تمھیں ایک ایماندار افسر کی بیوی ہونے پر فخر ہونا چاہیے۔"
پھر ایک دن ڈاکوؤں کا مقابلہ کرتے ہوئے ابا دونوں ٹانگوں اور ایک بازو کا نذرانہ دے کر گھر آ گئے۔ سرکار کی طرف سے تمغۂ جرأت اور ایک پلاٹ ملا۔
"لو بھئی اب تمھیں شہر شہر نہیں گھومنا پڑے گا۔" ابا نے اماں سے مذاق کیا تو اماں کی چیخیں نکل گئیں۔ دنوں، مہینوں ہم سب سہمے سہمے اداس اور پریشان سے پھرتے رہے
ایک روز اباجی نے اماں اور ہم سب کو اپنے پاس بلایا۔
"زبیدہ! تم سب کو کیا ہو گیا ہے۔؟ میں زندہ سلامت ہوں۔ اگر میں بھی دوسرے لوگوں کے ساتھ ختم ہو جاتا تو تم لوگ کیا کر سکتے تھے۔ یہ سب اللہ کی طرف سے ہے۔ آئندہ میں گھر میں ایسی ماتمی فضا نہ دیکھوں۔"
گھر بنانے سے پہلے ابا اور اماں کی کتنی بحث ہوا کرتی تھی۔ وہ اماں جنھوں نے زندگی بھر اباجی سے کبھی اختلاف نہیں کیا تھا کیسا کیسا ابا سے خفا ہوتی تھیں۔ ابا ایک کنال پر تین چار بیڈروم کا گھر بنانا چاہتے تھے۔ اماں بضد تھیں کہ ان کا ماشاءاللہ بھرا پرا کنبہ ہے۔ اس لیے کم از کم چھ بیڈروم کا گھر ہونا چاہیے۔
"تمھارا دماغ خراب ہو گیا ہے اتنا بڑا گھر کیا کرو گی۔؟"
"چار بیڈروم چاروں بیٹوں کے لیے ایک ہمارا کمرہ اور ایک گیسٹ روم"
"بچے کیا ساری عمر تمھارے گھٹنے سے لگ کر بیٹھے رہیں گے۔"
"اور کہاں جائیں گے۔؟ بیٹیاں تو خیر بیاہ کر اپنے گھر بار والی ہو جائیں گی، مگر بیٹے بہوئیں اور ان کے بچے تو ہمارے پاس ہی ہوں گے۔ پر بیٹیاں بھی تو خیر سے میکے آیا کریں گی۔"
"تم بالکل نادان ہو۔ میری بات یاد رکھو کبھی ان خالی کمروں کو دیکھ کر رویا کرو گی۔"
"اللہ نہ کرے۔ کیسی بدفال منہ سے نکال رہے ہیں۔ بس آپ بڑا گھر بنا کر نہیں دینا چاہتے تو نہ سہی۔" اماں رنجیدہ سی ہو کر بیٹھ جاتیں۔
جیت آخر اماں کی ہوئی اور زبیدہ لاج کی بنیاد

رکھ دی گئی۔ ابا جی نے ساہی وال والا اپنا آبائی گھر اور سرکار کی طرف سے جو پلاٹ ملا تھا اس کو بیچ کر ایک نئی سوسائٹی میں دو کنال پر پانچ بیڈ رومز کا بڑا خوبصورت بنگلہ بنوایا۔

جس روز وہ نئے گھر میں شفٹ ہوئے اُن سب کی خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ گھر کے باہر اماں اپنے نام کی تختی دیکھ کر پھولے نہیں سما رہی تھیں۔

اس گھر میں آنے کے دو تین سال بعد بڑے بھیا ڈاکٹر اور چھوٹے انجینئر بن گئے۔ اماں نے دونوں بیٹوں کی ایک ساتھ شادی کی۔ دو بہوئیں گھر لا کر مارے خوشی کے اماں کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے تھے۔ کیسا بھرا پُرا گھر تھا۔

''بڑے بھیا کی آواز پر وہ اپنے خیالات سے چونکی۔

''کہاں گم ہو صدف۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا اس بار میں نے سب کو ایک خاص مقصد کے لیے یہاں بلایا ہے۔'' صدف بھی ہمہ تن گوش ہو گئی۔

''میرا خیال ہے کہ اس گھر کو اور جو ساہی وال والی زمین ہے ہم فروخت کر دیں۔''

صدف کی مارے صدمے کے آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''بھئی دکھ تو مجھے بھی ہے۔ پر کیا کریں۔؟ ہم سب باہر کے ملکوں میں رہتے ہیں زمین کی دیکھ بھال ڈھنگ سے کرنے والا کوئی ہے نہیں اور پھر ہمیں اس زمین کا فائدہ بھی کیا ہے۔ چچا کے بیٹے ساری آمدنی کھا جاتے ہیں۔ کچھ سالوں بعد تم لوگ دیکھنا وہ قبضہ بھی کر لیں گے۔ اور یہ مکان آخر کب تک خالی پڑا رہے گا۔ بیکار میں چوکیدار کی تنخواہ بھرتے رہو۔ ہم میں سے شاید سوائے صدف کے کوئی بھی پاکستان میں سیٹل نہیں ہوگا۔ اور اگر کبھی کوئی واپس آیا تو وہ اپنی مرضی اور ضرورت کے مطابق گھر بنوا لے گا۔''

سوائے صدف کے سب نے ہی اس تجویز سے اتفاق کیا۔ صدف صدمے سے رونے لگ پڑی۔

''عجیب بیوقوف ہو تم بھی! اس میں رونے کی کیا بات ہے؟'' اپیا نے اس کا مذاق اڑایا ''آپ لوگوں کو کوئی دکھ نہیں ہوگا اماں ابا کی نشانی بیچ کر؟''

''پاگل ہو نری اینٹ پتھر بھلا نشانیاں ہوا کرتی ہیں۔؟''

وہ زچ ہو کر اُٹھ کر چلی گئی۔ ''ہائے اللہ کتنے مطمئن ہیں میرے بھائی بہن۔ دکھ کا ہلکا سا تاثر بھی نہیں ان کے چہروں پر۔ میں ہی کیوں ایسی ہوں۔ صدا کی ماضی پرست جھلی۔''

دوپہر کو سب سو گئے تو وہ باؤلوں کی طرح اوپر نیچے سارے گھر میں پھرتی رہی۔

''یہ کمرہ بڑے بھیا کا تھا۔ اور یہ ساتھ والا چھوٹے بھیا کا ان کے سامنے ان کا اور اپیا کا کمرہ تھا اور ان کے ساتھ والا چھوٹے

بھائیوں کا۔
نیچے ٹی وی لاؤنج سے داہنے ہاتھ پر اماں اور ابا کا کمرہ تھا۔
دونوں بھائیوں کی شادی کے بعد گھر میں رونق عروج پر تھی۔ اماں کی خوشی دیدنی تھی۔ ناشتے کی میز پر جب سب کرسیاں بھر جاتیں تو اماں ابا سے فخریہ کہتیں۔ ''دیکھا نا ماشاء اللہ کیسے ساری میز بھر گئی ہے۔ آپ تو کہا کرتے تھے اس خالی میز پر ٹیبل ٹینس کھیلا کرنا۔ اللہ نظر بد سے بچائے۔''
شادی کے دو اڑھائی سال بعد دونوں بڑے بھائی امریکہ چلے گئے۔ کچھ عرصے کے بعد انھوں نے اپنی بیویوں کو بھی بلا لیا۔ یوں اماں کی پوتے پوتیاں کھلانے کی حسرت دل میں رہ گئی۔ جب وہ دکھی ہوتیں تو دونوں چھوٹے بھائی تسلی دیتے۔ ''اماں اداس نہ ہوں ہم دونوں کے پورے ایک درجن بچے ہوں گے۔ وہ سب آپ کی گود میں ہی کھیلیں گے۔'' دم بھر کو ان کے چہرے پر مسکراہٹ آجاتی۔
اپیا بھی اپنے گھر سدھاریں۔ اماں کو مزید چپ لگ گئی۔
پھر یوں ہوا کہ ویسے ہی چھوٹے دونوں بھائی تعلیم سے فارغ ہوئے مزید پڑھنے کے لیے وہ دونوں ہی باہر سدھار گئے۔ ان کے جانے پر اماں کیا کیا نہیں روئیں۔ ان دونوں نے ضد سے پیار سے اماں کو منا ہی لیا۔
''اماں! کیا آپ نہیں چاہتیں کہ ہمارا مستقبل بھی شاندار ہو۔ یہاں پر اول تو نوکریاں ملتی کہاں ہیں۔؟ اگر مل بھی جائیں تو اس مہنگائی کے دور میں اتنی سی تنخواہ میں گزارہ کیسے ہوگا۔؟ ہم آپ کے لیے کچھ کرنا چاہتے ہیں۔ ہم وہاں سے اتنا کما کر بھیجیں گے کہ آپ اور ابا چین کی زندگی جی سکیں۔ آپ نے ہمارے لیے بڑی قربانیاں دی ہیں۔ اب ہماری باری ہے۔''
''بیٹا مجھے کچھ نہیں چاہیے۔ بس تم میری آنکھوں کے سامنے رہو۔ ہم تھوڑے میں گزارہ کرلیں گے۔ ویسے بھی اللہ نے ہمیں بہت دے رکھا ہے۔ تم ہمارے بڑھاپے کا سہارا ہو تمھارے معذور باپ کو اور مجھے صرف تم لوگوں کی ضرورت ہے۔ ہمیں تمھارا روپیہ نہیں چاہیے۔ ہمیں صرف تمھارا ساتھ چاہیے۔'' اماں کے آنسو موتیوں کی طرح گر رہے تھے۔
''اماں! پیاری اماں! آپ ہمارے راستے کی دیوار نہ بنیں۔ ہم وعدہ کرتے ہیں تعلیم مکمل ہونے کے بعد چند سال وہاں لگا کر واپس لوٹ آئیں گے۔''
''زبیدہ! ضد نہ کرو۔ انھیں ہنسی خوشی جانے کی اجازت دے دو۔ پرندوں کے بچے بھی اتنی دیر تک گھونسلے میں رہتے ہیں جب تک انھیں قوت پرواز نہیں ملتی اب یہ تمھارے پروں کے نیچے نہیں رہ سکتے۔ انھیں اب اپنی اپنی زندگی جینے دو۔''
سال پہ سال گزرتے چلے گئے اور آنے

والے پلٹ کر نہ آئے۔ ہر سال ایک نیا بہانہ تیار ہوتا۔ دونوں چھوٹے بھائیوں کی شادی کی اطلاع پر اماں اتنا روئیں کہ انھیں چپ کرانا مشکل ہو گیا۔ وقت نے ان کے خواب ان کی آنکھوں سے نوچ کر کہیں پاتال کی گہرائیوں میں پھینک دیئے تھے۔ ان کا ہر سپنا پانی کی لہروں پہ بنا ریت کا محل ثابت ہوا۔

"آپ ٹھیک کہتے تھے۔ بیکار میں نے ضد کر کے اتنا بڑا گھر بنوایا۔"

"دل چھوٹا نہ کرو۔ ذرا وہ سیٹل ہو جائیں تو چھٹیوں میں ضرور گھر آیا کریں گے۔"

ابا انھیں لاکھ تسلیاں دیتے۔ پر ان کے دل کی مرجھائی کلی پھر نہ کھل سکی۔ ابا کے انتقال کے بعد تو بالکل باؤلی سی ہو گئی تھیں (بھائیوں میں سے کوئی بھی جنازے پر نہیں پہنچ سکا تھا) پہروں یا تو گم صم رہتیں یا پھر اپنے آپ سے باتیں کرتی رہتیں۔ ابا کی پہلی برسی پر سب بہن بھائی اکٹھے ہوئے تھے۔ اماں بچوں کو دیکھ کر جیسے ابا کی وفات کا غم بھول سا گئی تھیں۔

مہینہ بھر وہ لوگ رہے۔ کیسی رونق تھی اماں کے چہرے پر۔

اماں کو یاد کر کے صدف کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ انگلی کی پور سے آنسو صاف کیے اور باہر لان میں آ گئی۔ کتنی یادیں اور محبتیں اس گھر کے چپے چپے پر لپٹی ہوئی تھیں۔ وہ کیسے بھول سکتی تھی۔ یہیں پر اس نے سہانے میٹھے سپنے دیکھنے شروع کیے تھے۔ اسی گھر میں اس کے دل نے دھڑکنا سیکھا تھا۔

اماں کو کتنا شوق تھا پھولوں اور پھلوں کا۔ لان کے چاروں کونوں پر رات کی رانی، ہار سنگھار، لیونڈر اور موتیے کے مہکتے ہوئے پودے تھے۔ کیاریوں میں ہر موسم کے پھول بہار دیتے۔ ٹیوب روز کی خوشبو سے سارا گھر مہک اُٹھتا۔ گرمیوں میں موتیے پر اتنے پھول آتے۔ صدف روزانہ جھولیاں بھر بھر پھول اتارتی اور ان کی لڑیاں پرو کر اماں کے جوڑے پر لپیٹ دیتی۔ وہ پانی کے گھڑوں کے گرد لپیٹ دیئے جاتے۔ سردیوں میں رات کی رانی مہکتی تو سارے گھر میں پاگل سی خوشبو اُڑتی پھرتی۔ بیک یارڈ میں آم، کچنار، لیموں اور نہ جانے کون کون سے درخت لگا رکھے تھے۔

وہ بے مقصد لان میں گھومتی رہی۔ سب پودے جھاڑ جھنکار بن چکے تھے۔ مہندی کے پودے کے پاس کھڑے ہو کر اسے بے اختیار رونا آ گیا۔

"ہائے اماں! یہ پودا آپ نے کتنے شوق سے لگوایا تھا۔"

مالی نے انھیں کتنا منع کیا تھا۔ "بی بی مہندی کا پودا نہ لگائیں۔"

"کیوں بھئی۔"

"سنا ہے۔ مہندی کے پودے کے نیچے سانپ رہتا ہے۔"

"ارے جانے دو ایسے ہی باتیں بنی ہوئیں

ہیں تم کیا جانو تازہ پتیاں پیس کر لگائیں تو رنگ کتنا اچھا آتا ہے۔ میری بہو بیٹیاں لگایا کریں گی۔'' کیا رنگ سا اتر آیا تھا ان کے چہرے پر۔

''ہائے یہ جامن کا پیڑ۔ اس کے تنے پر ابھی تک دو نام کھدے ہوئے تھے۔

''صدف اور عدنان۔ وہ بے دھیانی میں اُن ناموں پر انگلی پھیرتی رہی۔ نہ جانے کیوں اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے اور گالوں پر لڑھکتے ہوئے مٹی میں رُل گئے۔ اسے لگا ابھی وہ باڑھ پھلانگ کر آئے گا اور کہے گا۔

''اہو، صدف صاحبہ تشریف رکھتی ہیں۔''

''آپ کو کوئی اعتراض۔؟ وہ اترا جاتی۔

''بھئی میں اعتراض کرنے والا کون۔؟ بس ذرا سارا چمن رنگ و بو سے مہک رہا تھا۔ اور خوشبو نے خبر دی کہ تم آئی ہو۔''

آہ کیسے خوشیوں بھرے وہ دن تھے۔ گرمیوں کی لمبی دوپہریں وہ اسی باغ میں کھیلتے گزار دیتے۔ اماں ابا کے سونے کے بعد وہ سب بہن بھائی سوائے بڑی اپیا اور بڑے بھائیوں کے چپکے سے دبے پاؤں ٹھنڈے کمروں سے نکل آتے پڑوس کے بچے بھی آجاتے اور خوب کھیلتے۔ کیریاں توڑ کر نمک مرچ لگا کر کھائی جاتیں جھولا جھولتے، لکن میٹی کھیلتے۔

عدنان اور صدف تقریباً ہم عمر تھے۔ اس لیے اُن دونوں میں خوب بنتی تھی۔ عدنان ذرا دبو قسم کا لڑکا تھا۔ اور صدف تو پٹاخہ تھی۔ ایسی حاضر جواب کہ بڑوں بڑوں کو لاجواب کر دیتی۔ ہر بات کا گھڑا گھڑایا جواب اس کے پاس موجود تھا۔ سب شرارتوں کی سرغنہ، بولڈ اور نڈر۔ اونچے سے اونچے پیڑ پر منٹوں میں چڑھ جاتی۔ وہ درخت کی سب سے اونچی ڈال پر جھولتی ہوئی عدنان کو اوپر آنے کے لیے کہتی۔ وہ مارے خوف کے وہیں آنکھیں بند کیے کھڑا رہتا۔ ''بزدل'' وہ قہقہہ مار کر ہنستی اور بندر کی طرح اچک کر ایک ڈال سے دوسری پر لٹک جاتی۔

چاندنی راتوں میں وہ پہروں آنکھ مچولی کھیلتے، پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ دن پر لگا کر اڑ گئے اپیا بیاہ کر اپنے گھر چلی گئیں۔ دونوں بڑے بھائی اور بھابیاں باہر چلے گئے

عدنان انجینئرنگ کے آخری سال اور وہ ایم اے فائنل میں پہنچ گئی۔ عدنان اور صدف کی ابھی بھی دوستی تھی لیکن اب وہ سب اتنے مصروف تھے کہ دنوں ملاقات نہ ہو پاتی، مگر نادیہ اور صدف چونکہ کلاس فیلو تھیں اس لیے وہ اکثر اکٹھے ہی ہوتیں۔

عدنان کا انجینئرنگ کا رزلٹ آیا تو اس نے باہر جانے کی تیاری کر لی۔ وہ سب کتنا اداس تھے۔ خاص طور پر صدف کیونکہ وہ گہرے دوست تھے۔ امریکہ سے اکثر اس کے کارڈ آتے رہتے۔ دو سال کے بعد وہ اپنی والدہ کی بیماری کا سن کر ملنے آیا تو پہچانا نہیں جا رہا تھا۔

دبلے پتلے اور بقول صدف کے ٹیڑھی ٹانگوں اور مسکین سی شکل والے عدنان کی جگہ ایک خوبرو اور سمارٹ نوجوان میں ڈھل چکا تھا۔ صدف تو اسے دیکھ کر چیخ پڑی
''ارے واہ! تم تو اچھے خاصے نکل آئے ہو۔''
وہ جھینپ گیا سب نے بے ساختہ قہقہہ لگایا۔
''کیا مطلب؟''
''مطلب یہ کہ پہلے تو تم ڈھینگ سے ہوا کرتے تھے۔''
عدنان کے واپس جانے سے پہلے رحیم چچا اور چچی صدف کے لیے پرپوزل لے کر آئے، جو سب کے ساتھ ساتھ صدف کے لیے بھی باعث حیرانی تھا۔ مانا کہ وہ بچپن کے دوست اور ساتھی تھے، پر ایسا تو ان کے بیچ کچھ نہیں تھا۔ صدف نے صاف انکار کر دیا۔
اماں سے اچھی خاصی ڈانٹ پڑی ''واہ نواب زادی کے مزاج ہی نہیں ملتے۔ ارے گھر بیٹھے بٹھائے اتنا اچھا رشتہ مل رہا ہے۔ بچپن کے ساتھی ہو، تمھیں اور کیا چاہیے۔ رحیم بھائی اور بھابی سگے رشتے داروں سے بڑھ کر ہیں۔''
اس کے انکار کی وجہ سن کر سب بہت ہنسے
''لوگ سوچیں گے کہ میرا اور عدنان کا پہلے سے چکر چل رہا ہوگا۔''
''بیوقوف! ہمیں کیا لینا دینا لوگوں سے۔ ہمیں اور عدنان کے گھر والوں کو سب پتہ ہے۔'' ''اور اگر تم ایک دوسرے کو پسند بھی کرتے ہو تو کیا برائی ہے۔؟'' امی اپیا اور نادیہ نے اس کے خوب لتے لیے۔

عدنان کے واپس جانے سے پہلے منگنی کی رسم بڑی دھوم دھام سے ادا کی گئی۔ منگنی کے بعد صدف عدنان سے ذرا کم بات چیت کرتی تھی۔ وہ پریشان تھا کہ صدف شاید ابھی بھی خوش نہیں ہے۔ کہیں اس کے انکار کی وجہ کچھ اور تو نہیں۔ جب صدف کے کانوں تک یہ بات پہنچی تو اسے بہت غصہ آیا۔
شامت اعمال عدنان اسے لان میں اکیلا نظر آ گیا۔ صدف نے اس کی اچھی خاصی گوشمالی کی۔
''اب کیا میں اپنی منگنی پر بھنگڑا ڈالوں۔ چوبیس گھنٹے تمھاری طرح ٹوتھ پیسٹ کا اشتہار بن کر پھروں۔''
عدنان بے ساختہ ہنس پڑا۔
''لمبے لمبے دانت مت نکالو۔ اتنے خوبصورت نہیں۔'' صدف چڑ کر بولی۔
''یہ ہوئی نا بات۔ اب تم پہلے والی صدف لگ رہی ہو۔ یار مجھے تمھارا یہی روپ تو پسند ہے۔ بولڈ اور جھگڑالو۔''
پھر وہ مزید دو سال کے لیے چلا گیا۔ اس کے خط، کارڈ اور ٹیلی فون آتے رہتے۔ ٹیلی فون کی گھنٹی بجتی تو اس کی آواز آتی۔
''تمھاری آواز سننا چاہتا تھا اور ایک عدد ڈانٹ۔ بہت دن ہوئے تم نے ڈانٹا نہیں تھا۔
وہ جواباً ہنس کر کہتی ''بالکل پاگل ہو! چلو فون بند کرو۔ اتنا بل بن جائے گا۔ فضول خرچیاں مت کیا کرو۔ چچا کی بڑی حق حلال

کی کمائی ہے۔"

"محترمہ! اس کال کا بل میں تمہارے چچا کی کمائی سے ادا نہیں کروں گا۔ یہ میں اپنی کمائی سے ادا کروں گا۔" وہ ہنستا ہوا فون بند کر دیتا۔

پھر رفتہ رفتہ ان کے مابین فاصلہ بڑھنے لگا۔ اس کے خطوں اور کارڈوں میں کمی آنے لگی۔ فون بھی کم آنے لگے۔ اگر آتا بھی تو محسوس ہوتا جیسے اس کا دھیان کہیں اور ہے۔

وہ بہت دنوں کے بعد نادیہ کی طرف گئی، تو اسے لگا جیسے وہ اور آنٹی بے حد روتی رہی ہوں۔ اس کے پوچھنے پر نادیہ نے ٹال دیا۔ اسے دل میں برا لگا لیکن وہ خاموش رہی کہ ہوگا کوئی ذاتی مسئلہ جو وہ بتانا نہیں چاہتیں۔

نادیہ دن بدن عجب سی ہوتی جا رہی تھی۔ خاموش اور کھوئی کھوئی سی رہتی۔ صدف محسوس کر رہی تھی جیسے اندر ہی اندر کوئی کھچڑی پک رہی تھی۔ جو چپ نادیہ کو چچی کو لگی تھی وہی چپ اماں کو بھی لگ گئی۔ صدف کا دل بھی ہر دم پریشان رہنے لگا۔ بہت دنوں سے عدنان کی بھی کوئی خیر خبر نہیں تھی۔

ایک دوپہر اس نے نادیہ کو گھیر لیا۔ اپنی قسم دے کر آخر وہ نادیہ سے سچ اگلوانے میں کامیاب ہوگئی۔

"عدنان نے فون کیا تھا وہ نہ تو ابھی واپس آنا چاہتا ہے اور نہ ہی شادی کرنا چاہتا ہے۔" نادیہ نے روتے ہوئے بتایا۔

صدف نے غصے سے کھولتے ہوئے عدنان کو فون کیا۔ "تمہارا مسئلہ کیا ہے؟ مجھے سچ سچ بتا دو۔ یقیناً تمہارا کوئی چکر ہو گا۔"

"کوئی چکر نہیں ہے۔ میں بس ابھی اپنے آپ کو شادی کے لیے تیار نہیں پاتا۔ مجھے ابھی اپنا کیریئر بنانا ہے۔ میں پاکستان واپس آ کر چند ہزار روپوں کی نوکری میں گزارہ نہیں کر سکتا۔"

"تمہیں کیریئر بنانے میں کتنے سال لگیں گے۔؟ دو، چار، دس کتنے سال۔" صدف نے طنز کیا۔

"میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ اسی لیے میں تمہیں پابند نہیں رکھنا چاہتا۔"

"بہت اچھا کیا تم نے بتا دیا۔ مہربانی تمہاری۔" تھوڑی دیر دونوں کے درمیان خاموشی تیرتی رہی۔

"اس خوش فہمی میں مت رہنا کہ میں تمہاری محبت میں مری جا رہی ہوں۔ وہ تم تھے۔ جو مجھ سے شادی کرنا چاہتے تھے میں نہیں۔"

اور اس نے کھٹاک سے فون بند کر دیا اُن دنوں وہ کسقدر افسردہ اور دکھی تھی۔ محبت کے چھن جانے کے علاوہ اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت مارے جا رہی تھی۔ کیا میں اتنی بے مایہ تھی کہ عدنان نے اپنے کیریئر کی خاطر مجھے ٹھکرا دیا۔ اتنے سالوں کی دوستی تک کو وہ بھول گیا۔"

اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ وہ عدنان کا حشر کر دے بظاہر تو وہ یہ ظاہر کرتی تھی جیسے منگنی

ٹوٹنے کا اسے کوئی غم نہیں ہے۔ اور نہ ہی عدنان کی اسے رتی بھر پرواہ ہے لیکن حقیقت تو یہ تھی کہ اسے ہر چیز عدنان کی یاد دلاتی تھی۔ باغ میں جاتی تو چاندنی رات، موتیے کے پھول وہ کیسے جھولی بھر کر اس کے اوپر ڈالا کرتا تھا۔ بارش ہوتی تو اسے وہ بھیگی راتیں یاد آتیں۔ جب سب مل کر رات گئے تک تاش کھیلتے رہتے، بار بار چائے اور کافی پی جاتی۔ ایک روز پہلے دیکھی ہوئی فلم پر زور شور سے تبصرہ ہوتا۔ بیت بازی کی محفل جمتی۔

اب تو سب کچھ خواب لگتا تھا۔

ایک کہر آلود صبح رحیم انکل کی ڈیتھ ہو گئی۔

مرنے سے پہلے انھوں نے سختی سے منع کر دیا۔ خبردار اگر کسی نے میرے مرنے پر عدنان کو بلایا۔ وہ ہم سب کے لیے مر چکا ہے۔"

چچی پھر وں، صدف کو گلے لگا کر روتی رہتیں اس کی اور نادیہ کی کچھ ہی عرصے میں شادی ہو گئی۔ شادی کے کچھ مہینوں بعد وہ میکے آئی تو بڑوں میں تالہ پڑا تھا۔ چچی نادیہ کے پاس چلی گئی تھیں۔

صدف اپنے گھر میں خوش تھی۔ پھول سے بچے جاں نثار قسم کا شوہر۔ بظاہر وہ بہت مطمئن اور خوش تھی۔ پر دل میں ایک پھانس سی گڑی تھی۔ اس نے بہت کوشش کی کہ وہ عدنان کو کبھی یاد نہ کرے وہ عمر کے اس دور سے تعلق رکھتا تھا جو گزر چکا تھا۔ پھر پیچھے مڑ کر دیکھنے کا فائدہ ؟ مگر وہ مسلسل کسی نہ کسی بہانے یاد آتا رہا۔ اس کا خیال کسی آسیب کی طرح اس کا پیچھا کرتا ہی رہا۔ کیا وہ مجھے بھول چکا ہو گا۔؟ اس نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟ ان سوالوں کا اس کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ صدف کی شادی پر اس کا آخری کارڈ ملا تھا۔

"میں جانتا ہوں تم بہت پیاری لگ رہی ہو گی۔ خدا کرے تم سدا خوش رہو، ہو سکے تو مجھے معاف کر دینا۔

صدف نے غصے سے کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے تھے۔

ماربل کی بینچ پر بیٹھے بیٹھے اس کی ٹانگیں اور کمر تھک گئی تھی وہ اٹھنے کو تھی کہ آہٹ نے اسے چونکا دیا۔ وہ بے یقینی سے سامنے دیکھا کی۔ تخیل کی اڑان، نظروں کا دھوکہ یا واہمہ۔ باڑھ کے اس پار سے کوئی پھلانگ کر اس کی اور چلا آ رہا تھا۔ اس کا دل دھڑک کر منہ میں آ گیا۔ اس کے اردگرد تیز آندھیاں سی چلنے لگیں۔ آخر وہ لمحہ آن پہنچا۔ جس کا اسے برسوں سے انتظار تھا۔ لیکن اس وقت اچانک اسے سامنے پا کر اس کا جی چاہ رہا تھا کہ وہ اٹھ کر کہیں بھاگ جائے۔ لیکن نہ جانے کون سی قوت نے اس کے پاؤں جکڑ رکھے تھے۔ صدف نے دل کڑا کر کے نظر بھر کر عدنان کو دیکھا وہ کافی بدل گیا تھا۔ اس کا سرخ و سفید رنگ جھلس کر تانبے جیسا ہو چکا تھا۔ آنکھوں پر موٹے شیشوں کی عینک تھی۔

"کیسی ہو۔؟"

"اچھی ہوں۔"
"تم سے ملنے کی میں نے بہت دعائیں مانگی تھیں۔"
"کیوں۔؟" بالکل بھی نہیں بدلی ہو۔ نہ مزاج اور نہ۔" عدنان نے بات ادھوری چھوڑ دی۔
"کیا مطلب۔؟"
"میرا مطلب ہے اُسی طرح ہوں۔ وقت نے تم پر کوئی خاص اثرات نہیں چھوڑے۔"
"کتنا وقت گزر گیا۔" کچھ دیر کی خاموشی کے بعد صدف نے بات کرنے کے لیے سرا ڈھونڈا۔
"ہاں بہت سے بیت گیا۔" عدنان بلا مقصد ہی اپنی عینک کے شیشے صاف کرنے لگا۔
عدنان نے اس کے شوہر اور بچوں کی خیریت دریافت کی۔ جواباً اس نے بھی کی۔
عدنان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پھر اُن دونوں کے درمیان خاموشی کی چادر تن گئی۔
صدف جو اس سے پوچھنا چاہتی تھی۔ پوچھ نہیں پا رہی تھی۔ آج بھی اپنے ٹھکرائے جانے کی اذیت وہ بھولی نہیں تھی۔
"اس وقت تمہارا ملنا کسی معجزے سے کم نہیں۔" وہ بے چینی سے اپنے سر پر ہاتھ پھیر رہا تھا۔ آخر وہ ہمت کر کے بولا۔ "میں تمہارا گنہگار ہوں۔ میں برسوں سے تم سے معافی مانگنے کی حسرت دل میں لیے پھر رہا ہوں۔"
"معافی کیسی؟ جو آپ نے مناسب سمجھا کیا۔ جو وقت گزر گیا اب اسے دہرانے سے فائدہ؟"

وہ جانے کے لیے مڑی۔ وہ جو ہمیشہ عدنان کے ایک بار ملنے کی دعائیں مانگا کرتی تھی۔ تاکہ اپنی بے عزتی کا بدلہ لے سکے۔ اس گھڑی اب اس کے دل میں کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ بدلے کی بھاؤنا۔ نہ کچھ چھن جانے کا دکھ نہ کوئی احساس زیاں۔
"پلیز صدف! رکو...... جو میں کہنا چاہ رہا ہوں مجھے کہنے دو۔ پھر شاید زندگی میں موقع ملے نہ ملے۔ تم یقین کرو یا نہ کرو۔ میں نے زندگی میں جس لڑکی سے محبت کی، جس کو ٹوٹ کر چاہا وہ صرف تم ہو۔"
وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اس کی ہنسی اور نظروں میں طنز کی گہری کاٹ تھی۔
عدنان نے اپنی بات جاری رکھی۔ "میں نے تم سے دور جانے کا کبھی سپنے میں بھی نہیں سوچا تھا۔ جولین میری کلاس فیلو اور بڑی اچھی دوست تھی۔ میں اکثر اس کے ساتھ تمہاری باتیں کیا کرتا تھا۔ اور تمہارے لیے شاپنگ بھی اس کے ساتھ کرتا تھا۔
وہ عام امریکن لڑکیوں سے مختلف تھی۔ سلجھی ہوئی، سادہ مزاج اور نیک اطوار۔ آخری سمیسٹر میں دو ماہ رہ گئے تھے۔ دوسرے ممالک سے آئے ہوئے ہم سب لوگ اپنے اپنے وطن لوٹنے کے خیال سے بہت خوش تھے۔
انہی دنوں پہلے رمضان پھر عید آگئی۔ میں نے سوچا چلو اسی بہانے اکٹھے ہوتے ہیں۔ امتحانوں کے بعد تو سب اپنے اپنے آشیانوں کو لوٹ جائیں گے۔ اس رات میں نے کچھ

دوستوں کو ڈنر پر بلایا۔ رات گئے تک خوب ہنگامہ رہا۔ پھر سب لوگ چلے گئے میرے منع کرنے کے باوجود جوسلین رکی ہوئی تھی۔

"اپنے کمرے کی حالت دیکھو جیسے بھوت ناچ کر گئے ہوں۔ اکیلے سب کیسے کرو گے۔ تم کمرہ سیٹ کر لو۔ میں برتن دھو دیتی ہوں۔"

"رات زیادہ ہو جائے گی۔"

"تم مجھے چھوڑ آنا۔"

اے کاش وہ رات میری زندگی میں کبھی نہ آئی ہوتی۔ وہ رات جس نے میری ساری زندگی پر سیاہی پھیر دی۔ نہ جانے کب ہم دونوں کسی کمزور لمحے کی زد میں آ گئے۔ اس ایک لمحے نے ہم دونوں کو اپنی نظروں میں گرا دیا۔ ہم جو اتنے اچھے دوست تھے ایک دوسرے سے کترانے لگے۔ میں اپنے آپ سے اور جوسلین سے شرمسار تھا۔ وہ کیا سوچ رہی ہو گی میرے بارے میں کہ میں کتنا گرا ہوا انسان ہوں۔ اور میں تمھارا سامنا کیسے کروں گا۔؟ اتنے سالوں کی میری شرافت اور پارسائی مٹی میں مل گئی تھی۔

ایک دن جوسلین پریشان سی آئی اور اس نے میرے سر پر بم پھوڑ دیا۔ پھر میں نے اس سے شادی کر لی ہماری شادی ایک سال چلی۔ بچہ بھی پری میچور پیدا ہوا جو دنیا میں چند سانسیں لے سکا۔

بارہا میں نے چاہا کہ میں واپس آ جاؤں۔ اور سب سے معافی مانگ لوں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم مجھے کبھی معاف نہیں کرو گی۔ اور پھر اتنی دیر ہو گئی کہ واپسی کی تمام راہیں مسدود ہو گئیں۔

کاش میں لوٹ آتا۔ وقت بیت جائے تو انسان کے پاس پچھتاؤں کے سوا کچھ بچتا ہی نہیں۔"

اتنے سال بیتنے کے باوجود دوسری لڑکی کا سن کر اس کے دل میں کچھ چھن سے ٹوٹ گیا۔

"آپ یہ سب مجھے کیوں سنا رہے ہیں۔؟" وہ جل کر بولی۔

"صدف! میرا یقین کرو۔ وہ میری پہلی اور آخری بھول تھی۔ جس کی سزا میں آج تک بھگت رہا ہوں۔"

"مجھے اس جھوٹی کہانی پر رتی بھر اعتبار نہیں۔"

پھر وہ جانے کے لیے اٹھا وہ غیر ارادی طور پر اسے بڑھ کے دروازے تک چھوڑنے چلی آئی

"اندر نہیں آئیں گے۔ سب آئے ہوئے ہیں۔"

"کس منہ سے جاؤں۔"

"اسی منہ سے جیسا اب ہو چکا ہے۔" وہ بے اختیار مسکرا دیا۔

باڑھ پھلانگنے سے پہلے عدنان نے اسے مڑ کر دیکھا۔ اس آخری نظر میں جانے کیا کچھ تھا کہ وہ اسے خدا حافظ بھی نہ کہہ سکی۔ وہ اسے جاتا دیکھتی رہی۔ اس کی آنکھوں سے دو موتی گرے۔ اس نے اپنی ہتھیلیوں سے انہیں صاف کیا۔ ایک لمبا سانس لیا۔

پھر وہ انتہائی پرسکون اور ہلکی پھلکی اندر کی طرف چل دی۔

☆☆☆☆☆☆

شاہ داستان

سید شوکت علی شاہ، ضلع اٹک کے دور افتادہ قصبے تلہ گنگ میں پیدا ہوئے، پنجاب یونیورسٹی اور گورنمنٹ کالج لاہور سے ایم اے سیاسیات اور قانون کی ڈگری لی۔ بعد میں یونیورسٹی آف نیو ساؤتھ ویلیز سڈنی آسٹریلیا اور AIT تھائی لینڈ میں تعلیم حاصل کی۔ ان کا تعلق صوبائی سول سروس سے ہے۔

مصطفیٰ زیدی نے کہا "افسروں میں انھیں شاعر سمجھا جاتا ہے اور شاعروں میں افسر گردانا جاتا ہے۔ شاہ صاحب کی خوبی یہ ہے کہ افسروں میں انھیں اعلیٰ درجے کا ایڈمنسٹریٹر اور ادیبوں میں صفِ اول کا ادیب جانا جاتا ہے۔

شاہ صاحب پنجاب کے مختلف اضلاع میں دس سال تک ڈپٹی کمشنر رہے۔ کمشنر بہاول پور، ممبر پبلی کیشن سروس کمیشن، ممبر بورڈ آف ریونیو سیکرٹری انفارمیشن حکومت پنجاب اور چیئرمین لاہور آرٹس کونسل رہے۔

ان کی نو کتابیں منصۂ شہود پر آ چکی ہیں۔ زیرِ طبع کتاب 'شاہ داستان' تجسس اور تحقیق کے کئی در وا کرتی ہے۔ کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے نامور نقاد ڈاکٹر سلیم اختر نے لکھا اُس کتاب کے مقابلے میں مجھے اپنی سوانحِ عمری Min iature لگتی ہے۔

شوکت علی شاہ

باپ پر پوت، پتا پر گھوڑا: میرے چارج لینے کے کچھ روز بعد لاہور سے میاں نواز شریف کا فون آیا۔ بولے جیسا کہ آپ جانتے ہیں مخدوم حسن محمود اور اس کا والد غلام میراں شاہ فوت ہو گئے ہیں۔ حسن محمود کی سیٹ خالی ہو گئی ہے۔ یہ شخص میرا سخت مخالف تھا کیونکہ اسے قلق تھا کہ وہ وزیرِ اعلیٰ نہیں بن پایا۔ میرے مشیر کہتے ہیں اس کے بیٹے احمد محمود کو صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ ہرگز نہ دیا جائے کیونکہ یہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے گا۔ ویسے بھی سنا ہے کہ وہ ابھی تک پچیس سال کا نہیں ہوا۔ ساری صورت حال

کا جائزہ لے کر تین دن کے اندر رپورٹ کروتا کہ حتمی فیصلہ کیا جا سکے۔

میری آمد سے قبل ہی دونوں باپ بیٹا چل بسے تھے۔ غلام میراں شاہ بھونگ کے رئیس غازی کے بعد ضلع رحیم یار خان کے دوسرے بڑے زمیندار تھے۔ ان کی ایک ہزار مربع زمین تھی۔ ذوالفقار علی بھٹو لینڈ ریفارمز کے ذریعے جن زمینداروں کے قد چھوٹا کرنا چاہتا تھا ان میں یہ بھی شامل تھے۔ بھٹو کی ان سے تو کوئی خاص مخالفت نہ تھی لیکن وہ حسن محمود کا دشمن تھا۔ بھٹو کی پیر پگاڑا سے بھی مخاصمت تھی جو غلام میراں شاہ کا داماد تھا۔ پیر پگاڑا نے تو چالاکی سے سب زمینیں اپنے ہزاروں مریدوں کے نام کروا دی تھیں لیکن غلام میراں شاہ اتنا بڑا رسک نہ لے سکتا تھا۔ چنانچہ انتہائی کوشش کے باوجود اسے اپنی زمینوں کے ایک بہت بڑے حصے سے محروم ہونا پڑا۔ ویسے مخدوم صاحب بڑے زیرک اور جہاندیدہ انسان تھے۔ کئی شادیاں کر رکھی تھیں۔ جمال دین والی میں ان کا بہت بڑا ڈیرہ تھا۔ سو مربعے میں تو ان کا آموں کا باغ تھا جو غالباً پاکستان میں سب سے بڑا باغ تھا۔ سندھ کا کچیلا فارم بھی خاصا بڑا تھا۔ سب بڑے زمینداروں کی طرح غلام میراں شاہ بھی انانیت کے آخری موڑ تک پہنچ چکے تھے۔ انہوں نے گھر میں بے شمار تبرکات رکھے ہوئے تھے۔ قرآن شریف کے پرانے نسخے، حضرت علی سے منسوب تلوار، رسالت مآب کے فرضی یا اصلی پاپوش وغیرہ۔ ایک دفعہ قرآن پاک کے پرانے نسخوں کا ذکر ہوا تو کسی نے انہیں چھیڑنے کے لئے کہہ دیا کہ سندھ کے فلاں زمیندار کے پاس مقدس کتاب کا آٹھ سو سال پرانا نسخہ ہے۔ مخدوم صاحب کب پیچھے رہنے والے تھے۔ جھٹ سے بولے ''یہ کون سی خاص بات ہے۔ میرے پاس قرآن پاک کا ایک ایسا نسخہ ہے جو دو ہزار سال پرانا ہے۔''

حاضرین میں سے کسی کو بھی ان کی تردید کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔ سب نے بیک زبان کہا ''سبحان اللہ! ایسا نادر نسخہ آپ کے پاس ہی ہو سکتا ہے۔''

حسن محمود ان کا سب سے بڑا بیٹا تھا۔ بھائیوں میں وہ سب سے زیادہ زیرک، چالاک، ہوشیار اور تجربہ کار تھا۔ لاابالی طبیعت پائی تھی۔ والد صاحب کے نقش قدم پر چلتے ہوئے کئی شادیاں بھی کیں۔

جب ضیاء الحق نے الیکشن کے بعد وزیراعظم کی تلاش شروع کی تو اس نے جی ایچ کیو کے سند یافتہ پیر پگاڑا سے مشورہ کیا۔ گو پیر پگاڑا حسن

محمود کا بہنوئی تھا لیکن وہ بھی ان کی تیز قدمی اور سیاسی بصیرت سے خائف تھا۔ خانگی حالات بھی تیزی کے ساتھ خراب ہو رہے تھے۔ چنانچہ اس نے اپنے مرید خاص جونیجو کو حسن محمود پر ترجیح دی۔ بھاگتے چور کی لنگوٹی ہی سہی کے مصداق حسن محمود کی نگاہیں پنجاب کی وزارت علیہ پر ٹک گئیں۔ اب کے انہوں نے پیر پگاڑا کے بجائے وزیراعظم کی مدد چاہی۔ انہوں نے جونیجو کو کہا کہ وہ چیف منسٹری کے لئے ان کا نام تجویز کر لے۔ جونیجو نے یہ کہہ کر معذرت کر لی کہ ان کے اپنے ضلعے کے ایم پی اے بھی ان کے ساتھ نہیں ہیں۔ اس پر حسن محمود برجستہ بولا وزیراعظم بنتے وقت تمہارے ساتھ کون تھا؟ مخدوم صاحب کا استدلال تو درست تھا لیکن سیاست کی اپنی منطق ہوتی ہے۔ یہ اپنی راہیں خود متعین کرتی ہے۔ ویسے بھی اس وقت تک میاں شریف جنرل جیلانی کو مکمل طور پر معاشی شکنجے میں کس چکا تھا۔ ممبروں سے مشاورت کا محض ڈرامہ رچایا گیا تھا۔ جس کا مصنف، ایکٹر اور ڈائریکٹر جیلانی خود تھا۔ 'ون ہارس ریس' کا تاثر ختم کرنے کے لئے وہ میدان میں چند سیاسی گھوڑے لے آیا۔ حسن محمود کو مات دینے کے لئے اس کے اپنے ہی ضلعے سے ایک اُمیدوار رفیق حیدر لغاری کو 'بلاشیری' دی گئی۔ اٹک سے ملک اللہ یار کی شکل میں ایک نہایت ہی خشک مزاج شخص کی پیٹھ ٹھونکی گئی۔

حسن محمود وزیراعلیٰ تو نہ بن سکا لیکن اسمبلی میں بطور لیڈر آف دی اپوزیشن اس کی فصاحت کے جوہر کھلنے لگے۔ ان دنوں تقریر تو بڑی دُور کی بات ہے میاں صاحب سے چند جملے بھی صحیح اُردو میں نہ بولے جاتے تھے۔ انگریزی بھی واجبی تھی۔ وہ انہیں زچ کرنے کا کوئی موقعہ ہاتھ سے نہ جانے دیتا۔

لیکن زندگی نے زیادہ دیر تک اس سے وفا نہ کی۔ والد کی وفات کے کچھ عرصہ بعد ہی وہ نیویارک کے ایک فلیٹ میں حرکت قلب بند ہونے سے چل بسا۔ اس ڈرامائی موت پر بھی کافی تبصرے ہوئے لیکن سب سے زیادہ خراج عقیدت ایک انگریزی اخبار کے کالم نویس نے پیش کیا۔ اس نے لکھا:

He died with his boots on --!

اس تناظر میں میاں نواز شریف کو ان کے مشیروں نے مشورہ دیا کہ حسن محمود کے بیٹے کو ٹکٹ نہ دیا جائے۔ احمد محمود کو جب میں نے اپنے کیمپ آفس بلایا تو اس سے مل کر بڑی حیرانی ہوئی۔ دُر یتیم! رحیم یار خان کے سیّد گھرانے کا چشم و چراغ، سیاسی اعتبار سے بے یارومددگار۔ اسے دیکھتے ہی جذبہ ترحم، چاہت اور انصاف بیک وقت عود کر آئے۔ ہمدردی کا

ایک ایسا مدوجزر اُٹھا کہ میں نے آپریٹر کو کہا کہ وہ وزیراعلیٰ سے فوراً فون ملائے۔ میاں صاحب سے بات کرانے سے پہلے میں نے اسے صرف ایک نصیحت کی۔ لمبی چوڑی بات نہیں کرنی۔ صرف یہ کہنا ہے کہ ''آپ سے بات کر کے مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے حسن محمود ہنوز زندہ ہیں۔''

ان دو لفظوں نے میاں صاحب کے دل کا میل صاف کر دیا۔ تمام کدورت دھو ڈالی۔ شکوک و شبہات بھاپ بن کر اُڑ گئے۔ فرط جذبات سے ان کے لفظوں میں ارتعاش پیدا ہوا۔ مجھے کہنے لگے میں اس کا ٹکٹ بھجوا رہا ہوں، لیکن عمر کا کیا بنے گا۔ سنا ہے یہ ''انڈر ایج'' ہے۔ میں نے کہا یہ فیصلہ کرنا عدالتوں کا کام ہے۔ اس وقت اس خاندان کے متعلق ہمدردی کی جو لہر اُٹھی ہے وہ سارے ضلع میں دوڑ رہی ہے۔ اوّل تو کوئی شخص مقابلے کی ہمت نہیں کرے گا، بالفرض کھڑا بھی ہوا تو ضمانت ضبط کروا بیٹھے گا۔

مخدوم غلام میراں شاہ اس کی سیاسی تربیت کرنا چاہتے تھے لیکن زندگی نے مہلت نہ دی۔ حسن محمود کے اپنے مشاغل اس قدر تھے کہ اس کے لئے اولاد کی تربیت کے لئے وقت نکالنا مشکل تھا لیکن سب سے بڑا اُستاد، ناصح اور حلیف تو خود وقت ہوتا ہے۔

احمد نے ایم پی اے بنتے ہی پر پرزے نکالنے شروع کر دیے۔ وزارت کا سوال اُٹھا تو میاں صاحب مخدوم الطاف کو وزیر بنانا چاہتے تھے۔ میں نے مخالفت کی۔ میں نے انہیں بتایا کہ یہ تو حساب کا بڑا سیدھا سا سوال ہے۔ احمد محمود کے ساتھ ضلع کے سب ایم پی اے اور ایم این اے ہیں جبکہ مخدوم الطاف بالکل اکیلا ہے۔ ممبران کی خواہشات کے برعکس عمل کیا گیا تو اس کے منفی نتائج تو ہوں گے۔ مجھ سے اتفاق کرتے ہوئے وزیراعلیٰ نے اپنا فیصلہ بدل دیا اور احمد محمود کو ایکسائز اینڈ ٹیکسیشن کا وزیر بنا دیا۔ مخدوم الطاف کو اس بات کا اس قدر قلق ہوا کہ وہ ساری عمر مجھ سے ناراض رہا۔

چالباز چیف سیکرٹری کی چالاکیاں: ان دنوں میاں صاحب کو ہٹانے کی باقاعدہ منصوبہ بندی شروع ہو گئی تھی۔ ان کا محسن اور مربی جنرل جیلانی بے اثر ہو چکا تھا۔ بریگیڈیر قیوم کو بھی نئی سرسبز چراگاہوں کی تلاش تھی۔ ضیاء الحق کے کان بھی مسلسل بھرے جا رہے تھے۔ چیف سیکرٹری جٹ ہونے کے ناطے چوہدری پرویز الٰہی سے درپردہ ملا ہوا تھا۔ ایک دن بے نظیر نے اچانک اعلان کر دیا کہ وہ کسان ریلی کو ایڈریس کرنے رحیم یار خان سے جلوس کی

شکل میں ٹوبہ ٹیک سنگھ جائے گی۔ مقصد پنجاب حکومت کو گرانا تھا۔ سندھ سے ہزاروں لوگ اباڑو پہنچ گئے۔ چیف سیکرٹری نے ہمیں حکم دیا کہ اس کو پنجاب داخل ہونے کے بعد دفعہ ۱۴۴ ض ف کی خلاف ورزی پر گرفتار کرلیا جائے۔ وہ دراصل جلتی پر تیل ڈالنا چاہتا تھا۔ اس ''سول ان ریسٹ'' کو چوہدری صاحبان کی بغاوت سے ہم آہنگ کرنا مقصود تھا۔ ہمیں اس کا کھیل سمجھنے میں زیادہ دیر نہ لگی۔ چنانچہ یہ فیصلہ ہوا کہ بے نظیر کو کسی صورت گرفتار نہ کیا جائے لیکن اس کے ساتھ ہی Momentum build up کرنے کی بھی اجازت نہ دی جائے۔ کمشنر اور ڈی آئی جی بھی رحیم یار خان پہنچ گئے۔ رات کے بارہ بجے ہم میٹنگ کر رہے تھے کہ راؤ رشید، افضل سندھو اور قائم علی شاہ کینال ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔ ان کا اصرار تھا کہ صبح جلوس کو Safe Passage دیا جائے نہیں تو بڑا خون خرابا ہوگا۔ میں نے کمشنر اور ڈی آئی جی کو کہا کہ وہ اندر جا کر آرام کریں۔ ہم ان سے بات کر لیتے ہیں۔ میرے ساتھ انعام الرحمٰن سحری ایس ایس پی تھا۔ کافی دیر تک بحث مباحثہ ہوتا رہا۔ رات تین بجے تک یہ سلسلہ جاری رہا لیکن کوئی قابل عمل حل نہیں نکل پا رہا تھا۔ عین ممکن تھا کہ مذاکرات ناکام ہو جاتے لیکن ہم آخری بات انہیں ذہن نشین کرانے میں کامیاب ہو گئے۔ میں نے سوال کیا'' بے نظیر کا رحیم یار خان میں ورود بذات خود کوئی مقصد ہے یا حصول مقصد؟ ہم کچھ سمجھے نہیں۔ انہوں نے وضاحت چاہی:

Her entry in R.Y.Khan is not an end itself. It is only a means to an end, the end being to reach Toba tek singh and address the rally, Thereby conveying her message not only to the down Trodden of Pakistan but to the whole world.

اب اگر محترمہ یہاں گرفتار ہو جاتی ہیں تو ہو سکتا ہے کہ ضلع میں خون خرابہ ہو لیکن اس اعلیٰ وارفع مقصد کی تکمیل نہیں ہو پائے گی۔ ہم انہیں اور آپ کو ہر قسم کی نقل و حرکت کی اجازت دیتے ہیں لیکن ہزاروں بسوں کے قافلے کو ساتھ نہیں جانے دیں گے۔ بات اُن کی سمجھ میں آ گئی اور وہ ہمارے ساتھ زبانی معاہدہ کر کے چلے گئے۔

اگلی صبح میں ایس ایس پی اور دو سو سپاہیوں کو لے کر کوٹ سبزل چیک پوسٹ پر پہنچ گیا۔ کوٹ سبزل سندھ اور پنجاب میں حد فاصل ہے۔ دس بجے بے نظیر قافلہ لے کر چیک پوسٹ پر پہنچی تو گیٹ کھلے ہوئے تھے۔ جونہی اس کی گاڑی پنجاب میں داخل ہوئی ہم نے گیٹ بند کر دیے۔ اس طرح سارا قافلہ سندھ میں ہی رُک گیا۔ مشتعل لوگوں نے نعرہ بازی کی لیکن کسی کو گیٹ توڑنے کی ہمت نہ ہوئی۔ چند گھنٹوں کے جاں گسل انتظار کے بعد بسیں واپس سندھ چلی گئیں۔ میں دفتر آیا تو چیف سیکرٹری کا فون آ گیا۔ وہ غصے سے پھنکار رہا تھا "بے نظیر کو گرفتار کیوں نہیں کیا؟" وہ دھاڑا۔

"کیونکہ دفعہ ۱۴۴ کی خلاف ورزی نہیں ہوئی۔"

"How is it possible? I smell a rat"

اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہو پا رہا تھا۔ "آپ سپیشل برانچ سے چیک کیوں نہیں کر لیتے۔" میں نے اس کی تسلی کرنا چاہی۔

You all are the chips of the same bloc کہہ کر اُس نے فون بند کر دیا۔ اس کے خلاف شکایتیں تو پہلے ہی آ رہی تھیں۔ جب میاں صاحب کو اس سازش کا پتہ چلا تو انہوں نے اُس کی چھٹی کرا دی اور انور زاہد کو چیف سیکرٹری مقرر کر دیا۔

چار کا ٹولا: اس واقعہ کے فوراً بعد ہی میاں نواز شریف کا فون آیا۔ کہنے لگے "شاہ صاحب آپ نے بے نظیر کے دورے کے وقت بڑی موثر حکمت عملی سے کام لیا ہے لیکن خطرہ ابھی ٹلا نہیں۔ اب بھی میری حکومت کے خلاف سازشیں ہو رہی ہیں۔ جو چار کا ٹولہ سرگرم ہے اُن میں ایک رفیق حیدر لغاری ہے۔ میری اس سے صلح کرا دیں۔ عمارت کا ایک ستون گر جائے تو وہ زیادہ دیر تک کھڑی نہیں رہ سکتی۔ یہ مشکل کام تھا لیکن میں نے حامی بھر لی۔ رفیق حیدر لغاری سے میری پرانی دوستی تھی۔ جن دنوں جنرل جیلانی کے اُکسانے پر وہ وزارت علیہ کے لئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا میں، نسیم کے حق اور میاں بشیر اس کے دعا گوؤں میں شامل تھے اور اکثر اس کی کوٹھی (لاہور) میں جا کر اپنی نیک خواہشات کا اظہار کیا کرتے تھے۔

رفیق حیدر لغاری کو رام کرنے میں تھوڑا وقت لگا۔ جب میں نے اسے بتایا کہ جنرل جیلانی نے اسے بے وقوف بنایا ہے اور اس طرح اسے وزارت سے بھی محروم کر دیا ہے تو اسے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میرا دوسرا استدلال یہ تھا کہ ایک مرتبہ پھر وہ سیاسی

غلطی کر رہا ہے۔ ضیاء الحق اگر میاں صاحب سے ناراض ہے بھی تو یہ ناراضی زیادہ دیر قائم نہیں رہے گی۔ میاں صاحب کے اس کے برادر نسبتی ڈاکٹر بشارت الٰہی اور اسلم خان سے خصوصی مراسم ہیں۔ یہ جلد ہی اسے رام کر لیں گے۔ میری باتیں اس نے غور سے سنیں لیکن شک کا شائبہ پھر بھی قائم رہا۔ چند دنوں بعد ہی ضیاء الحق کا بیان آ گیا کہ نواز شریف کا کلہ مضبوط ہے۔ اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ مرونا اپنی عمر عزیز کا کچھ حصہ بھی نواز شریف کی نذر کرنے کا عندیہ دیا۔ تیسری ملاقات میں لغاری ڈھیر ہو گیا۔ میرا استدلال یہ تھا کہ بالفرض نواز شریف ہٹ بھی جاتا ہے تب بھی وہ تو وزیر اعلیٰ نہیں بن سکتا۔ زیادہ سے زیادہ وزیر بن جائے گا جو وہ اب بھی بن سکتا ہے۔ تو ان حالات میں ایک Certain چیز کو چھوڑ کر uncertain کی طرف لپکنا سیاسی دانشمندی نہیں ہے۔

میں لغاری کو لے کر لاہور پہنچا تو رات کے دو بجے رہے تھے۔ وہاں میاں نواز شریف سے صلح کرائی۔ دونوں بغلگیر ہوئے۔ طے یہ پایا کہ صبح وہ پریس میں اپنا بیان دے گا اور پھر میاں صاحب اس کی دعوت پر رحیم آباد آ جائیں گے جہاں پر دونوں لیڈر جلسہ عام سے بھی خطاب فرمائیں گے۔ اس کے فوراً بعد ہی میاں صاحب رحیم آباد آئے۔ رحیم آباد صادق آباد تحصیل کا قصبہ ہے جو دریائے سندھ کے کنارے پر ہے۔ اس کے ساتھ ہی بھونگ کا وہ مشہور قصبہ ہے جو رئیس غازی کی بنائی ہوئی مسجد کی وجہ سے مشہور ہے۔ مسجد میں جو مینا کاری کی گئی ہے وہ قابل دید ہے۔ اس مسجد کو آغا خان ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔ رئیس غازی نے بھی دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی سے رئیس شبیر اور رئیس وزیر ہیں اور دوسری سے رئیس محبوب، مطلوب وغیرہ۔ مسجد کو بنانے میں اسے تیس سال لگ گئے۔ کسی طور مشہور ہو گیا تھا کہ مسجد مکمل ہوتے ہی وہ چل بسے گا۔ اس کے ذہن میں یہ خیال اس قدر راسخ ہو گیا کہ وہ عمداً تاخیر کرتا رہا اور اس کے ساتھ ساتھ کام بھی بڑھاتا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ مسجد آج تک مکمل نہیں ہوئی۔ لگتا ہے تھوڑا بہت اثر اس کی اولاد نے بھی لیا ہے لیکن اس کا یہ فائدہ ضرور ہوا ہے کہ خوب سے خوب تر کی تلاش میں مسجد کی تزئین و آرائش جاری ہے اور ہر نیا خیال اس کے حسن میں اضافہ کرتا رہتا ہے۔ مسجد سے ملحقہ بازار ہے۔ بازار ختم ہوتے ہی قصبہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔ دریائے سندھ کی کسی نے آن بان اور شان

دیکھنی ہو تو مسجد کی چھت پر چڑھ کر دیکھے۔ یہاں پر دریا کا پاٹ بارہ میل تک پھیلا ہوا ہے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مٹھن کوٹ ہے جہاں سرائیکی شاعر خواجہ فرید کا مزار ہے۔ خواجہ صاحب نے شاعری کو ایک نیا آہنگ دیا۔ سوز و گداز بخشا۔ اب جبکہ ان کی کافیوں کے تراجم دوسری زبانوں میں ہونے لگے ہیں تو دنیا کو پتہ چلا ہے کہ ریت اور ببول کے کانٹوں والے دیس میں کس قدر زرخیز ذہن بستے تھے۔

میاں صاحب نے بیس ہزار کے مجمعے کو خطاب کیا۔ ان دنوں وہ اتنے اچھے مقرر تو نہیں تھے لیکن ایک وزیر اعلیٰ کا دور دراز قصبے میں آنا ہی بڑی بات تھی۔ سب لوگوں کے لئے لغاری نے کھانے کا بندوبست کیا تھا۔ اس کے علاوہ لاکھوں روپے خرچ ہوئے۔ جو لوگ وطن عزیز میں سیاست کو آسان سمجھتے ہیں انہیں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہئے کہ یہ غریب آدمی کے بس کا روگ نہیں ہے۔ ایک دفعہ احمد ندیم قاسمی نے کہا تھا کہ تھل کو آباد ہونے میں ایک طویل عرصہ لگے گا۔ اسی طرح یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ پاکستان میں ذہنوں کو زرخیز ہونے اور سیاسی پختگی پیدا ہونے میں بھی ایک عمر لگے گی۔

مرگ ناگہانی: ایک سہ پہر میں کوئی کتاب پڑھ رہا تھا کہ ڈسٹرکٹ انفارمیشن آفیسر عطا بلوچ کا فون آیا۔ ستلج کے پل کے قریب کوئی جہاز گر گیا ہے۔ ''کیا کوئی پسنجر جہاز تھا؟''

بولا ''نہیں فوجی لگتا ہے۔''

''کون تھا اس میں؟'' میں نے پوچھا۔ ڈر کی وجہ سے وہ نام نہیں بتا رہا تھا۔ میں نے ٹی وی لگایا تو اس میں کوئی عام سا پروگرام چل رہا تھا۔ ان دنوں آج کل کی طرح چینلز کی بھرمار نہ تھی اور ہر اطلاع صرف پاکستان ٹیلی ویژن سے نشر اور نچڑ کر آتی تھی۔ میرا ماتھا ٹھنکا۔ ضرور کوئی گڑبڑ ہے وگرنہ ایک عام جہاز کے گرنے کی اطلاع دینے کی کوئی تک نہ تھی۔ میں نے کمشنر سے بات کرنا چاہی تو وہاں بھی فون مسلسل مصروف جا رہا تھا۔ اس وقت تک موبائل فون بھی مارکیٹ میں نہیں آئے تھے۔ مجھے یہ اندازہ لگانے میں دشواری پیش نہ آئی کہ حادثہ نمبر ایا نمبر ۲ کو پیش آیا ہے۔ خیال نمبر ا کی طرف ہی جاتا تھا کیونکہ جونیجو صاحب کی چھٹی کرا دی گئی تھی۔ وہی ضیاء الحق جو اسے بڑی دھوم دھام سے لایا تھا، نے بے عزت کر کے نکال دیا۔ جونیجو کسی دورے پر گیا ہوا تھا کہ جنرل صاحب نے 58.2.B کا کلہاڑا چلا دیا۔ ضیاء الحق کی زیادتی اپنی جگہ لیکن جونیجو

صاحب کو بھی'' کچھ مہینوں مرن داشوق وی سی'' پرویز مشرف کے برعکس ضیاء الحق جمہوری حکومت کے قیام کے بعد عملاً انتظامی امور سے الگ ہو گیا تھا۔ جیسے جیسے وہ پیچھے ہٹتا گیا ان کی پیش قدمی جاری رہی۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ اس کے بیرون ملک دوروں کے لئے شرکا کی جو فہرست ایوان صدر سے وزیراعظم کو جاتی اس میں بھی کٹوتی ہو جاتی۔ گویا صدر کے ساتھ صرف وہی لوگ جا سکتے تھے جو وزیراعظم کے منظور نظر تھے۔ فوج کی توہین اور تضحیک ہونے لگی۔ اوجڑی کیمپ کے حادثے پر بھی تہمت کی انگلیاں صدر اور آئی ایس آئی کی طرف اٹھیں - وزیراعظم نے باقاعدہ انکوائری کا اعلان فرما دیا۔ سمجھ نہیں آتی کہ ایک فوجی صدر کے ہوتے ہوئے انہیں اس قسم کی جرأت اور جسارت کیسے ہوئی۔ اگر یہ فیصلے اصولی تھے تو پھر معزولی کے بعد جس وقار کا تقاضا ان کا منصب کر رہا تھا اس پر وہ پورے نہ اُتر سکے۔ آخری درخواست بھی کی تو یہ کہ انہیں سندھڑی جانے کے لئے فیلکن جہاز دیا جائے اور الٰہی بخش سومرو کو کوئی عہدہ نہ دیا جائے۔

ضیاء الحق نے جونیجو کو تو فارغ کر دیا لیکن خود ایک بہت بڑے مخمصے میں پھنس گیا۔ آئین کی رُو سے اسے تین ماہ میں الیکشن کرانے تھے۔ ایک طرف گہرا سمندر تھا تو دوسری جانب سنگلاخ چٹانیں۔ بے نظیر واپس آ چکی تھی۔ جونیجو پر بھی مظلومیت کی چھاپ لگ گئی تھی۔ ان حالات میں اپنی مرضی کی پارلیمنٹ لانا مشکل تھا۔ وہ اس سیاسی گرداب سے نکلنے کا راستہ تلاش کر رہا تھا کہ جہاز کا حادثہ پیش آ گیا۔ کافی عرصے سے اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔ انٹیلی جنس کی رپورٹیں بھی آ رہی تھیں کہ ہاتھیوں کی یلغار ہونے والی ہے۔ اس نے اپنے دورے محدود کر دیے تھے۔ بالآخر مجبوری بہاولپور آنا پڑا تو وہ ہراس آدمی کو ساتھ لے آیا جو کچھ کر گزرنے کا اہل تھا۔ حتیٰ کہ امریکن سفیر کو بھی سیفٹی والو سمجھ کر ساتھ بٹھا لیا۔

جب عزائم بڑے ہوں تو بسا اوقات اپنوں کی بھی قربانی دینا پڑتی ہے۔ چنانچہ سب ایک ساتھ عدم آباد رخصت ہوئے۔ باوجود شدید خواہش کے کسی ڈر یا خوف کی وجہ سے اسلم بیگ اقتدار نہ سنبھال سکا۔ جہاز کی روانگی سے پہلے یہ بھی اس کے ہمراہ تھا۔ اس نے دوسرے جہاز میں سفر کیا۔ چونکہ ساری قوم اس پر شک کر رہی تھی اس لئے ٹیک اوور کر کے وہ ان خدشات کو تقویت نہ دینا چاہتا تھا۔

[جاری ہے۔]

سید فخر الدین بلّے ___ بلّے بھئی بلّے

روشنی کا سفر علی گڑھ سے شروع ہوا تھا۔
منزل نصیب ہوئی مدینۃ الاولیا ملتان میں۔
میں نے اپنی تیز رفتار جوانی میں۔ طلوع اور غروب ہوتی جمہوریت کے دنوں میں ادبی اور سیاسی محفلوں میں یہ نام بہت سنا تھا۔ بلّے صاحب۔ سید فخر الدین بلّے۔ عالی جی بہت ذکر کرتے تھے۔ حنیف رامے سے بھی بہت حوالے سنے۔ لاہور کے ایڈیٹرز۔ صحافی۔ شاعر بھی بلّے بلّے کرتے تھے۔ آج نصف صدی بعد عالمگیر وبا کے دور میں جب تنہائی ہماری ہمدم ہے۔ میں ایک گہرے تاسف میں ہوں۔ میرے سارے بزرگ۔ ہم عصر۔ سید فخر الدین بلّے کی تخلیقی۔ تحقیقی۔ تصدیقی صلاحیتوں اور قربتوں کا ذکر کر رہے ہیں۔ میں اپنی یادوں کے ہجوم میں اس مشفق۔ مونس۔ محترم چہرے کی تلاش میں ہوں۔ ماہ و سال تیزی سے بن برسے بادلوں کی طرح گزر رہے ہیں۔ وہ چہرہ وہ منزل نظر نہیں آ رہی۔ ہر سمت دُھند پھیلی ہوئی ہے۔ غبار اُڑ رہا ہے۔ چھٹنے ہی نہیں پاتا۔ دھواں ہی دھواں ہے:

ہے آب آب موج بپھرنے کے باوجود
دنیا سمٹ رہی ہے بکھرنے کے باوجود

راہِ فنا پہ لوگ سدا گامزن رہے
ہر ہر نفس پہ موت سے ڈرنے کے باوجود

.....

میں سیاستدانوں کی بھیڑ میں کھویا رہا۔ قیمتی لمحے تاریکیوں میں ڈوبتے رہے۔ اہلِ علم۔ صاحبانِ دانش کی صحبتوں سے محروم رہا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ خود بھی جنگلوں۔ جھاڑیوں میں بھٹکتا رہا۔ پھول فخر الدین بلّے صاحب کی محفلوں میں کھلتے رہے۔ حکمت کی مے لاہور۔ ملتان اور بہاولپور میں بٹتی رہی۔
ظفر معین بلّے کا شکر گزار ہوں کہ کوڈ کے اندھیروں میں انہوں نے میرا ہاتھ تھاما ہے۔ دوسرے ہاتھ میں" سید فخر الدین بلّے۔ ایک

محمود شام

آدرش ایک انجمن" تھائی ہے۔ تو 70 اور 80 کی دہائیاں کہکشاں بن کر میرے سامنے سج رہی ہیں۔ آل احمد سرور میری رہنمائی کر رہے ہیں۔ 'فخر الدین بلے نے دانشوری اور پُرسوز عقلیت کی جو شمعیں جلائیں، ان کی روشنی سرحد پار بھی پہنچی ہے۔'

برحق۔ برملا۔ علم کی روشنی۔ دانش کی خوشبو کو سرحدیں نہیں روک پاتیں۔ خاردار باڑ بھی احساس اور ادراک کی راہ مسدود نہیں کر سکتی۔ پروفیسر منظر ایوبی اپنے مخصوص گھن گرج والے لہجے میں نور میرٹھی کے حوالے سے مجھے بتا رہے ہیں۔

''عمر کے ابتدائی اور تعلیمی ادوار میں مولانا ابوالکلام آزاد۔ ڈاکٹر ذاکر حسین۔ مولانا حسرت موہانی۔ مولوی عبدالحق۔ رشید احمد صدیقی۔ جگر مراد آبادی۔ تلوک چند محروم۔ علامہ نیاز فتح پوری۔ سیماب اکبر آبادی۔ سر شاہنواز بھٹو اور مولانا عبدالستار نیازی جیسے اکابرین کی محبتیں حاصل رہیں۔ ہم عصر صاحبانِ علم میں احمد ندیم قاسمی۔ سعادت حسن منٹو۔ فیض احمد فیض۔ میرزا ادیب۔ ڈاکٹر سید عبداللہ۔ احسان دانش۔ قدرت اللہ شہاب۔ صہبا لکھنوی۔ ڈاکٹر وحید قریشی۔ جگن ناتھ آزاد۔ صادقین۔ حفیظ جالندھری۔ مشکور حسین یاد سے خصوصی مراسم رہے''۔

اللہ اللہ۔ کیسی کیسی باکمال ہستیوں۔ ایک ایک اپنی جگہ مکتبِ خرد۔ جسے یہ محبتیں حاصل رہی ہوں۔ اس کا ذہن کتنا تاباں۔ فکر کتنی درخشاں ہوگی۔

میرے جھنگ کے خوبرو عاشق اُردو خواجہ محمد زکریا افسوس کر رہے ہیں کہ مجھے بلّے صاحب سے صحبت نہیں رہی۔ وہ تو خوش قسمت ہیں کہ فخر الدین بلّے صاحب کے کوارٹر کے عین سامنے سکونت پذیر رہے۔ ان کو یہ افتخار حاصل رہا کہ بلّے صاحب کی رہائش گاہ پر ہونے والی غیر رسمی محفلوں میں شریک ہوتے رہے۔ جہاں سوال جواب ہوتے۔ بذلہ سنجی اور ذکاوت کے مظاہرے بھی۔ بلّے صاحب تحمل کا پیکر تھے۔ ان کے بچوں نے بھی باپ ہی کے مزاج پر خود کو ڈھال رکھا تھا۔ ظفر معین بلّے اکثر میرے ہاں تشریف لاتے رہتے تھے۔ بڑے شائستہ اور منکسر المزاج نوجوان تھے۔ معلوم نہیں آج کل کہاں ہیں۔؟

میں بزمِ خیال میں خواجہ صاحب کو بتا رہا ہوں کہ ظفر معین بلّے شہر قائد میں ہیں۔ بحیرہ عرب کے کنارے۔ مجھے یہ فخر حاصل ہے کہ وہ میرے حلقہء اطراف میں ہیں۔ بہت مہربان ہیں۔ شام اطراف میں شریک ہوتے ہیں۔ شعر و ادب کی محفلوں کی جان ہیں۔ ہمیں ان میں بھی فخر الدین بلّے صاحب کی شفقت۔ انس۔ تحمّر۔ مزاج شناسی دکھائی دیتی ہے۔

بابائے اُردو مولوی عبدالحق جب یہ کہہ رہے ہوں کہ سید فخر الدین بلّے کی نظم ہو یا نثر، اس میں کوئی نقص نکالنا محال ہے۔

فراق گورکھپوری کی آواز سنئے۔ ''سید فخر الدین بلّے رنگوں کے بجائے الفاظ سے تصویریں بنانے کا ہنر جانتے ہیں۔''

ڈاکٹر وزیر آغا سے ہماری قربت رہی ہے۔ جھنگ شہر سے سرگودھا ان کی 58۔ سول لائنز والی کوٹھی پر حاضر ہوتا رہا ہوں۔ سرگودھا ہمارا ننھیال بھی ہے۔ سسرال بھی۔ ڈاکٹر وزیر آغا خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ نظم گوئی اور انشائیے کی طرف ہمیں رغبت دلاتے رہے۔ وہ کہہ رہے ہیں۔

''تصوف کے موضوع پر ان کی نظر اتنی گہری ہے کہ آپ بلا تکلف انہیں اس سلسلے میں ایک اہم اتھارٹی قرار دے سکتے ہیں۔''

میرزا ادیب اُردو کہانی میں ایک بالکل منفرد آواز۔ ان سے ہماری نیاز مندی رہی ہے۔ کہتے ہیں۔ ''ہر ملاقات میں ان کی شخصیت کا ایک نیا رُخ سامنے آیا۔ میں اس کثیر الجہت شخصیت کو پورے اعتماد کے ساتھ علم و ادب کی آبرو۔ قرار دے سکتا ہوں۔''

جمیل الدین عالی جو خود ایک ہمہ جہت انسان تھے۔ 'انسان' پر ان کی طویل نظم ایک شاہکار ہے۔ 'جنگ' میں ان کے کالم کئی عشروں تک ذہن و دل کو ولولہء تازہ دیتے رہے۔ وہ بات ہی یہاں سے شروع کر رہے ہیں۔ ''سید فخر الدین بلّے ایک شخصیت نہیں بلکہ ایک ادارے۔ ایک تنظیم۔ ایک انجمن اور ایک جہان کا نام ہے۔ وہ ایک گھنا اور سایہ دار پیڑ تھے، جس کے سائے تلے آ کر بہت سے لوگ دھوپ سے بچے اور اس پیڑ کے پھل سے لطف اندوز ہوئے۔ اس سے آکسیجن بھی حاصل کی۔ اور اس کی خوشبو سے مشام دل و جاں کو معطر بھی کیا۔ انہیں اُردو، فارسی۔ انگریزی اور ہندی زبانوں پر قدرت حاصل تھی۔''

ظفر معین بلّے صاحب۔ آپ نے مجھے اپنی عاقبت سنوارنے کا موقع دیا۔ بلّے صاحب جیسی طرحدار مجموعہء اوصاف ہستی کے بارے میں جاننے میں تعاون کیا۔ علمی ادبی حلقوں میں آج کل ایسی ہمہ صفت شخصیات کہاں ملتی ہیں؟ جو شعر و ادب کی پرورش کرتی ہوں۔ اہل علم و دانش سے محبت رکھنے کے لیے بے تاب ہوں۔ علم و دانش کی روشنی پھیلانے والی محفلیں برپا کرتی ہوں۔ آج کل تو سرکاری رہائش گاہوں میں ٹھیکیداری کے مجمع لگتے ہیں۔ ڈالروں اور درہموں کی باتیں ہوتی ہیں۔ تبادلے تقرریاں زیر بحث آتی ہیں۔ اَن پڑھ حکمرانوں سے تعلق اور رابطے تلاش کیے جاتے ہیں۔

سید فخر الدین بلّے میرے لیے اس وقت ایک مرشد اور محبوب کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ میں ان کی صحبت میں زیادہ عرصہ گزارنا چاہتا ہوں۔ ظفر معین بلّے ہی یہ پیاس بجھانے میں میری رہنمائی کریں گے۔ ان کی شاعری سے باضابطہ فیض حاصل کروں گا۔ ان کے مخطوطات۔ مکتوبات۔ مضامین سے گزروں گا۔ پھر اپنے اس سفر کی داستان اپنے قارئین اپنے سامعین کی نذر کروں گا۔

اپنی بات بلّے صاحب کے اس شعر پر ختم کروں گا کہ یہی آج کا چلن ہے۔

ہم شب میں رند بن کے رہے، دن میں متقی
دنیا میں اس چلن سے بڑی آبرو رہی

☆☆☆☆☆

شہداستان

قلم پر گرفت، الفاظ کا درست چناؤ، تحریر میں روانی بہت بڑا وصف ہے بظاہر اکتسابی لیکن اکتساب کے لیے ذہانت درکار جو قدرت کا عطیہ ہے۔ ''بیاض'' کا سب سے زیادہ دلچسپ اور معلومات افزا حصہ وہ صفحات ہیں جو شاہ داستان پر مشتمل ہیں۔ میرے نزدیک شاہ داستان اس لیے شاہ داستان نہیں کہ داستان سرا کے نام کے ساتھ شاہ آتا ہے بلکہ اس مفہوم میں شاہ داستان ہے جس مفہوم میں شاہ شاہسوار، شاہکار، شہروز کے ساتھ آتا ہے۔ فہرست مندرجات میں اس کا عنوان آپ بیتی درج ہے شاید آپ بیتی سے آبیتی لیکن اسے آ اور بیتی سے ترکیب یافتہ بھی پڑھا جاسکتا ہے۔ انگریز فلسفی، منطق استقرائیہ کے مبینہ بانی فرانسس بیکن کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ فلسفہ اس طرح لکھتا ہے گویا اس میں بھی لارڈ چانسلر (سب سے بڑا مالیاتی عہدہ) ہو۔ خورد برد کا مرتکب ہوا، مواخذہ ہوا، معافی مانگ کر جان چھڑائی۔ شاہ داستان کے مصنف ڈپٹی کمشنر، کمشنر بھی رہ چکے ہیں، جب دفتر چھوڑا تو ڈپٹی کمشنر، کمشنر کے قلم بھی وہیں چھوڑ آئے کہ قوم کی امانت تھا۔ شاہ داستان اپنے ذاتی قلم سے لکھی نظر آتی ہے۔ قلندر ہر چہ گوید دید گوید۔ اسی لیے پڑھنے والوں کو تردد کا بلکہ اختلاف کا بھی موقع فراہم نہیں رہنے دیا ورنہ:

جب ہم ماضی کو لکھتے ہیں
کب لکھتے ہیں جو بیتا تھا
وہ لکھتے ہیں جو چاہا تھا
(منصورہ احمد)

یہی بات تاریخ کو مسخ کرتی چلی آرہی ہے۔ شاہ داستان اس عیب سے پاک ہے۔ تاہم کئی ذیلی باتوں کے اضافے کی سہولت سے کسی بھی قاری کو محروم بھی نہیں ہونے دیا جو یہ سمجھتا ہے کہ ایسی باتیں صاحب داستاں کے احاطۂ توجہ میں آنے سے رہ گئیں۔

بیاض، (اکتوبر 21) کی قسط اس لحاظ سے بھی

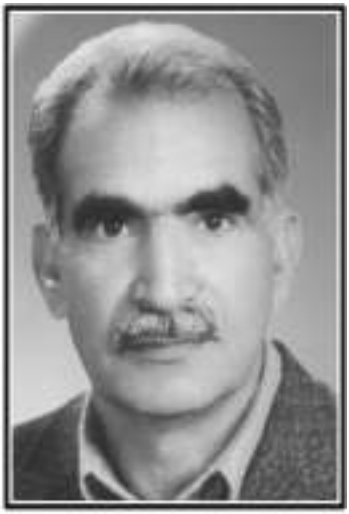

محمد ارشاد

دلچسپ ہے کہ اس میں مسلمانانِ برصغیر کے عظیم محسن سرسید کی خدمات اور ان کی راہ میں روڑے اٹکانے والوں کا ذکر بھی آیا ہے۔ انگریزوں نے حکومت مسلمانوں سے چھینی تھی اور وہ مسلمانوں کو ناقابلِ اعتماد رعایا سمجھتے تھے۔ 1857 کے بعد ان کا یہ خیال اور بھی پختہ ہو چکا تھا۔ ایک انگریز ہنٹر نامی نے اپنی ایک کتاب میں مسلمانوں پر اسی قسم کے الزامات لگائے، جن کا سرسید نے وافی جواب دیا اور مسلمانوں کی وفاداری کا یقین دیا۔ یہی وقت کا تقاضا تھا۔ سرسید کا جواب 'ہنٹر پر ہنٹر' کے نام سے چھپ چکا ہے۔ لارڈ میکالے نے انگریزی زبان کی ترویج اور نئے نصابِ تعلیم کی طرح ڈالی اور لکھا کہ انگریزی کا ایک شیلف عربی فارسی کتب کی پوری لائبریری پر بھاری ہے۔ اگر جدید علوم کے حوالے سے بات کی جائے تو بات درست بھی تھی۔ مسلمان اپنے تعلیمی اداروں میں جو کچھ پڑھ رہے تھے خصوصاً فلکیات، طب، فزکس، کیمیا وغیرہ میں فرسودہ اور از کار رفتہ تھا۔ اس پر سید جمال الدین افغانی نے بھی طنز کرتے ہوئے اپنے ایک مضمون میں لکھا تھا کہ جس لیمپ کی روشنی میں 'شمس بازغہ' پڑھتے ہو، بھڑ کنے لگ جائے تو تم اتنا بھی نہیں جانتے کہ لیمپ کیوں بھڑک رہا ہے۔ لیمپ (لالٹین) مغرب کی ایجاد ہے۔ شمسِ بازغہ منطق کی کتاب جو درسِ نظامی میں شامل ہے۔ لالٹین اور شمس بازغہ (طلوعِ آفتاب) کا ایک ساتھ ذکر معنی خیز ہے۔

سید السادات مولانا جمال
(مصرعِ اقبال)

سرسید نے زیادہ جدید علوم و فنون کے حامی تھے۔ سرسید کے مخالفین میں سب سے بڑا نام انہی کا ہے انھوں نے یہ کہا تھا کہ ہندو اور مسلمان مل کر پیشاب بھی کر دیں تو یہ چند انگریز جو ہندوستان پر حکومت کر رہے ہیں ڈوب کر مر جائیں۔ سرسید نے ہندوستان کے مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے جگانے کے لیے تہذیب الاخلاق نکالا اور سید السادات نے دنیا بھر کے مسلمانوں کو بیدار کرنے کے لیے عُروۃُ الوُثقیٰ۔ جس میں سرسید کے معتزلہ کی فراہم کردہ بنیادوں پر قائم نئے علم کلام نیچریزم کے خلاف عربی میں مضامین بھی لکھے جن کا اردو ترجمہ رد نیچریت کے نام سے چھپ چکا ہے۔ کسی مسلمان ملک نے عروۃ الوثقیٰ چھاپنے کی اجازت نہیں دی تھی یہ رسالہ فرانس سے طبع ہوتا تھا۔ نبی اپنے لوگوں میں اجنبی ہوتے ہیں۔ یہ آدھ نبی بھی اپنے لوگوں میں اجنبی ہی رہا۔ آج ہندوستان میں، کل ایران میں پرسوں مصر میں، ترسوں ترکی میں کبھی فرانس، کبھی سوڈان۔

باآشیاں نہ نشیمم لذتِ پرواز
گے بشاخِ گلم گاہ بر لبِ بوئیم

.....

کہیں بھی کسی نے ٹھہرنے نہ دیا۔ تہران میں سخت جاڑے میں برف بستہ سڑکوں پر

انھیں گھسیٹا گیا۔ مصر سے بیک بنی و دو گوش نکال دیا گیا ترکی میں زہر آلود خلال بطور تحفہ دے کر انھیں شہید کر دیا گیا۔ میت بعد میں افغانستان پہنچا دی گئی۔

زمن بجرم طپیدن کنارہ می کردی
بیا بخاک من و آرمید نم بنگر

آج سُنی یہ کہتے ہیں کہ وہ سُنی تھے، شیعہ کہتے ہیں وہ شیعہ تھے۔ افغانستان کے صوبہ گزنی کے گاؤں اسد آباد کے سادات کہتے ہیں وہ ہمارے اجداد میں تھے۔ ایران کے استان ہمدان کے گاؤں اسد آباد کے سادات کا دعویٰ ہے کہ ہمارے اجداد میں فلاں کے ساتھ ان کا یہ یہ رشتہ تھا۔ حق یہ ہے کہ وہ ان Petty تفاریق سے کہیں بالا تھے۔ سوڈان کے ایک مقبول سنی عالم کو انگریزوں کے مقابلے میں مہدی کا دعویٰ کرنے پر آمادہ کیا۔ اس مہدی سوڈانی نے لارڈ کچنر کو پے در پے شکستیں دیں۔ ایران میں شیعہ علما سے تمباکو نوشی کو حرام قرار دینے کا فتویٰ دلوایا کہ فرانسیسی تاجر تمباکو کی تجارت کی آڑ میں ایران کو لوٹ رہے تھے اور ناصر الدین شاہ قاچار نے ایران کا بہت کچھ گروی رکھ کے ایران کو قرضے میں ڈبو دیا تھا۔ ہندوستان میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد ہو کر انگریزوں کو جو مٹھی بھر تھے، کھدیڑنے پر آمادہ کرتے رہے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں میں ایسی منافرت موجود نہیں تھی جو آج ہے۔ انگریزوں نے دونوں میں divide + Rule کی پالیسی کے تحت معمولی سی خلیج کو اور بھی وسیع کر دیا۔ اورنگزیب عالمگیر کو ہندوؤں کا دشمن بنا کر پیش کیا۔ شبلی نعمانی نے اورنگزیب عالمگیر پر ایک نظر لکھ کر غلط فہمی دور کرنی چاہی لیکن بہت سا پانی بہہ کر سمندر میں جا چکا تھا۔

ہم اس بیّن اور ناقابل تردید حقیقت کو بھول جاتے ہیں کہ سید علی ہجویری، خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، نظام الدین اولیا، دکن میں سید محمد گیسو دراز اور اس طرح کے اور کئی اہل اللہ کے ہاتھ پر لاکھوں ہندوؤں نے اسلام قبول کیا تھا جن کے کئی ہم نسب ہندو بدستور ہندو تھے۔ کئی تیموری شہزادے اور بادشاہ ہندو ماؤں کی اولاد تھے۔ بے شک رانا سانگا، رانا پرتاب، سیواجی مرہٹہ مسلمان حکمرانوں کے خلاف لڑتے بھی رہے ہیں لیکن ایسا تو مسلمان حکمران بھی کرتے رہے ہیں، بابر اور ابراہیم لودی، شیر شاہ سوری اور ہمایوں اور ہندو راجے بھی آپس میں برسر پیکار رہے ہیں جے پال اور جے چند بزمانہ محمود غزنوی، ہندوؤں اور مسلمانوں میں باہمی نسبی تعلق نے ہی دونوں کو 1857 میں انگریزوں کے خلاف متحد کیا تھا۔ سارے مسلمان سرحد پار سے نہیں آئے تھے۔ ہمیں اولیا اللہ کے کارناموں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔ تاہم اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانان برصغیر ہندوؤں کی اولاد ہونے کی وجہ سے یا پھر انگریزوں کی چالوں میں آ کر ہندوؤں سے بڑھ

کر غلامانہ ذہنیت کے حامل ثابت ہوئے۔
غالب نے کہا تھا: کون چھڑوا آزاد ہوا ہے، کل گورے کی قید میں تھا آج کالے کی قید میں ہوں۔ ہم کل گورے (انگریز) کی قید میں تھے آج بھی گورے (امریکہ) کی قید میں ہیں۔ سچ کہا تھا اقبال نے:

اگر قبول کرے دین مصطفےٰ انگریز
سیاہ روز مسلماں رہے گا پھر بھی غلام

اور یہ بھی کہا تھا:

یورپ کی غلامی پہ رضامند ہوا تو
مجھ کو تو گلہ تجھ سے یورپ سے نہیں ہے

.....

اقبال جلال الدین (بلخی ثم رومی) اور جمال الدین افغانی کے معنوی شاگرد تھے۔ دونوں بزرگوں کا تعلق افغانستان سے تھا، جس کے باسیوں نے دو سپر پاورز سوویت یونین اور امریکہ کو ناکوں چنے چبوائے۔ اقبال کی طرح ابوالکلام آزاد بھی سیدالسادات کے معنوی شاگرد تھے۔ اقبال نے شاعری کے ذریعے اور آزاد نے نثر کے ذریعے جو شاعری سے کم دلآویز نہیں تھی اپنے معنوی قائد سیدالسادات کا مشن جاری رکھا، اس نثر کے ذریعے جس کے بارے میں ایک اور مرد حُر حسرت موہانی نے کہا:

جب سے دیکھی ابوالکلام کی نثر
نظم حسرت میں کچھ مزا نہ رہا

.....

اگر اقبال کی شاعری جلال و جمال کا حسین امتزاج ہے تو ابوالکلام کی نثر بھی جلال و جمال، قرآن کے معجزاتی آہنگ کا بے مثال نمونہ۔ سید السادات جمال الدین کے نزدیک تمام مسلمان ایک ملت ہیں، ایک ہی نبیؐ کی امت ہیں، اوطان اس میں رخنہ نہیں ڈال سکتے۔ یہی پیغام اقبال کا بھی تھا۔

تو قیاس ان کو کبھی اقوام یورپ پر نہ کر
خاص ہے ترکیب میں قوم رسول ہاشمی

.....

تمام مسلمان ممالک زمین کے مرکز میں واقع ہیں اور ایک دوسرے سے ملحق۔ اسی حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہا:

تہران ہو گر عالم مشرق کا جنیوا
شاید کرۂ ارض کی تقدیر بدل جائے

.....

کہ تہران کو ہی عالم اسلام میں مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ ملت کے اسی تصور کی بنا پر کہا:

بتانِ آرزو کو توڑ کر ملت میں گم ہو جا
نہ افغانی رہے باقی نہ ایرانی نہ تورانی

.....

مسلمانوں نے اوآئی سی تو بنالی لیکن اس کی افادیت معرض سوال میں چلی آ رہی ہے۔ کشمیر میں، فلسطین میں مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ ہے، یہی کچھ برما میں ہو رہا ہے۔ بوسنیا میں مسلمان قتل ہوتے رہے۔ یہی کچھ بھارت میں ہو رہا ہے۔ انڈونیشیا میں سوا لاکھ عیسائیوں کے لیے مشرق تیمور کو الگ کر کے علیحدہ ملک بنا دیا گیا۔ سوڈان

میں عیسائیوں کے لیے ملک تقسیم کر دیا گیا۔ افغانستان چالیس سال تک جنگ کا اکھاڑہ بنا رہا۔ لیبیا، عراق، شام کے ساتھ جو کچھ ہوا قصہ ماضی نہیں۔ یمن اور سعودی عرب برسرپیکار ہو رہے ہیں۔ پاکستان کے دو ٹکڑے ہو گئے۔ اور بھی بہت کچھ ہونے کو باقی ہے۔ بھیڑیے گدھوں کے پٹھے کا بہترین گوشت آرام سے کھاتے رہتے ہیں آفرین ہے گدھوں کی ثابت قدمی پر پُرسکون کھڑے رہتے ہیں کان کھڑے نہیں ہلاتے۔ یہی کچھ مسلمان بھی کر رہے ہیں۔ کان کھڑے ہلائیں گے تو امریکہ اور غضبناک ہو جائے گا۔ یو این او کی طرف دیکھتے ہیں جو امریکہ کی جیب میں ہے۔ امریکہ جمہوریت اور انسانی حقوق کا سب سے بڑا محافظ ہے۔ افغانستان میں وسیع البنیاد حکومت چاہتا ہے، ہونی چاہیے۔ لیکن ریڈ انڈینز (امریکہ کے اصل باسی) میں سے کبھی کوئی امریکہ کا صدر، سیکرٹری آف سٹیٹ، جنرل، سفیر بنا ہے؟ امریکہ آزادی اظہار کا بھی سب سے بڑا مبلغ ہے لیکن کیا امریکہ اور یورپ کا کوئی شہری ہولوکاسٹ کو یہودیوں کی من گھڑت کہانی کہہ کر قید اور جرمانے کی سزا پانے سے بچ سکتا ہے۔ ہٹلر کی تعریف میں ایک جملہ بھی بول سکتا ہے۔ یا یہ کہہ سکتا ہے کہ ساٹھ لاکھ یہودی تو اس وقت پورے یورپ میں بھی موجود نہیں تھے جن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ ہٹلر کے حکم سے گیس چیمبرز میں بند کر کے ہلاک کر دیے گئے یا یہ کہہ سکتا ہے کہ جس گیس کا ذکر کیا جاتا ہے وہ اتنی مہنگی تھی اور آج بھی ہے کہ اس کی نسبت گولیاں مفت پڑتیں۔ یا یہ کہہ سکتا ہے کہ این فرینک کی ڈائری ایک بارہ سالہ بچی کی نہیں ایک ادیب کی لکھی ہوئی ہے۔ امریکہ عورتوں کے حقوق کا بھی سب سے بڑا پاسبان ہے۔ عورتوں کے حقوق کیا ہیں۔ میرا جسم میری مرضی۔ بغیر نکاح کے زن وشوئی۔ یہی امریکہ یورپ تو کیا یہاں بھی ہونے لگا ہے۔ عورتوں کو ان کے جائز حقوق تو پہلے بھی حاصل نہیں رہے علی الخصوص کراچی کے اردو بولنے والے لوگوں میں اور پنجاب میں۔ جہیز سسرال والوں کی فرمائش پر نہ لانے والیوں پر ظلم کے قصے اکثر سننے میں آتے رہتے ہیں۔ امریکہ آزادی صحافت کا محافظ ہے۔ BBC کے دو صحافیوں نے ایک کتاب Publish it not کے عنوان سے چھپوا ہی دی۔ کتاب کا عنوان ہی یہ ثابت کر رہا ہے کہ کس قسم کی صحافت آزاد ہے اور کس قسم کی صحافت آزاد نہیں۔ اسرائیل کے کرتوتوں پر تنقید کی اجازت نہیں۔ امریکہ میں صدارت کے ہر امیدوار کو اسرائیل کے بارے میں پالیسی بیان دینا پڑتا ہے۔ سچ کہا تھا اقبال نے:

فرنگ کی رگ جاں پنجۂ یہود میں ہے

اور مسلم دنیا کی رگ جاں پنجہ فرنگ ہیں اور در پردہ پنجۂ یہود ہیں۔ یاد نہیں پڑ رہا کہ برٹرینڈ رسل کی کسی تحریر میں یا اس کے حوالے سے کسی اور کی تحریر میں پڑھا تھا کہ دنیا کے 65 فیصد وسائل پر امریکہ کا قبضہ ہے اور ان وسائل کے 85 فیصد پر یہود کا قبضہ۔ دنیا بھر میں یہودیوں کی تعداد 2 کروڑ ہے، ڈیڑھ کروڑ امریکہ میں اور باقی اسرائیل اور دوسرے ملکوں میں۔ دنیا کی کل آبادی سات ارب ہے اور دو کروڑ یہودی اس آبادی کا کتنے فیصد بنتے ہیں حساب لگانا مشکل نہیں۔ ورلڈ بینک، آئی ایم ایف دیگر بڑے بڑے بینک، فیٹف اور اس طرح کے دیگر ادارے انٹرنیشنل سطح پر مقروض کرنے اور اکثر ممالک کو مقروض رکھے رہنے کے لیے تو ہیں ہی۔ امریکہ اور دیگر مغربی ممالک میں بھی ان کے بینکوں کا جال پھیلا ہے۔ ٹی وی چینل، اخبار، رسائل، اسلحہ ساز فیکٹریاں سب کے مالک ہیں۔ لیکن امریکہ کی اصل طاقت اس کے ہوائی جہاز، ایٹم بم اور بہترین فوجی اسلحہ نہیں کہ یہ چیزیں کچھ دوسرے ممالک کے پاس بھی ہیں۔ ویت نام میں سپیریئر اسلحے کے باوجود ذلت آمیز شکست کھا کر بھاگا 23 سو ہوائی جہاز گنوائے۔ تو پھر امریکہ کی اصل طاقت کیا ہے؟ ڈالر! جن کی ہر ملک کو ضرورت ہے زرمبادلہ کے ذخائر کی صورت میں۔ کسی بھی ملک میں موجود یہی ذخائر یہ پتہ دیتے ہیں کہ اس ملک کی معیشت کس حال میں ہے چاہے کوئی ملک مقروض نہ بھی ہو۔ ہر حکومت اپنے عوام کو یہ بتا کر مطمئن کرتی رہتی ہے کہ پہلے اتنے بلین ڈالر زرمبادلہ کے ہمارے پاس تھے اب اتنے ہیں۔ کسی بھی ملک کی کرنسی کی بمقابلہ ڈالر گھٹتی بڑھتی قیمت وہاں کرنسی کی قوت خرید کا تعین کرتی ہے، ین ہو یا یوان، روپیہ ہو یا بھات، تومان ہو یا ریال سب کی قوت خرید کا پیمانہ یہی ڈالر ہے۔ اگر سارے ممالک لین دین میں ڈالر چھوڑ کر کوئی دوسری کرنسی یا کرنسیاں استعمال کرنا شروع کر دیں تو امریکہ کا کیا حال ہو پیشگوئی ممکن نہیں، اتنا کہنا ضرور ممکن ہے کہ امریکہ ایسا نہیں ہونے دے گا کہ اس وقت دنیا بھر کے خزائن میں جتنے ڈالر موجود ہیں واپس امریکہ پہنچ جائیں تو inflation آجائے امریکہ کی معیشت بیٹھ جائے اور ساتھ ہی طاقت بھی جواب دے جائے۔ امریکہ (در پردہ یہودی) آکاس بیل کی صورت ہر درخت (ملک) پر چھتری کی صورت موجود ہے۔ یہاں تک کہ پاکستان تک میں ایک عالم دین اور سیاسی پارٹی کے رہنما نے اسلام کی وہ تعبیر کی جو سرمایہ دارانہ نظام کی تائید میں تھی کیونکہ امریکہ کو اصل خطرہ سوویت یونین سے تھا جہاں کمیونزم رائج تھا۔ ہر چند کمیونزم کی طرح کیپٹلزم بھی ایک menace کی صورت میں دنیا پر مسلط ہے اور امریکہ اس کی تجسیم۔

ایوب خان کے دور میں پاکستان ترقی کر رہا تھا۔ تربیلہ ڈیم اور منگلا ڈیم اسی کے دور میں بنے۔ پشاور کے ایئر بیس سے، جو مکمل طور پر امریکہ کے قبضے میں تھا اور کوئی پاکستانی چڑیا بھی امریکیوں کی مرضی کے بغیر پر نہیں مار سکتی تھی چہ جائیکہ کوئی پاکستانی بڑے سے بڑا افسر امریکہ کے جاسوسی یوٹو طیارے سوویت یونین پر اڑانیں کرتے تھے۔ سوویت یونین نے یوٹو مار گرایا اور وزیر اعظم خروشچیف نے دھمکی آمیز بیان دیا کہ پشاور پر سرخ دائرہ لگا دیا گیا ہے۔ مذکورہ ایئر بیس کی مدت معاہدہ ختم ہوئی تو ایوب خان نے اس کی تجدید سے انکار کر دیا۔ امریکہ سارے انڈے ایک ٹوکری میں نہیں رکھتا، حزب اختلاف کی جماعتوں سے بھی رسم و راہ رکھتا ہے۔ اس کے سفیر اور خفیہ ایجنسیوں کے لوگ ان سے رابطے میں رہتے ہیں۔ چینی ایک روپیہ چار آنے (25 پیسے) سے ایک روپیہ پانچ آنے کلو ہوئی تو لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ایوب خان کو گھر جانا پڑا۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بھارت کے مقابلے میں ایٹمی پروگرام کی طرح ڈالی۔ امریکہ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ وقت سے پہلے الیکشن کروا بیٹھا، نہ صرف خود بلکہ صوبوں کے وزرائے اعلیٰ بھی ''بلامقابلہ'' منتخب ہو گئے۔ یہ دھاندلی تھی۔ لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے، بھٹو کو جیل اور پھر پھانسی گھاٹ جانا پڑا۔ ضیا الحق نے ایٹمی پروگرام جاری رکھا۔ امریکہ بے خبر نہیں تھا لیکن افغانستان میں سوویت یونین کے خلاف ضیا الحق کی ضرورت تھی اندرونی وجوہ کی بنیاد پر روس، بیلوروس اور اُکرائن نے سوویت یونین سے علیحدگی اختیار کر لی دیگر ریاستیں بھی روس کے نکل جانے سے خود بخود الگ ہو گئیں اور سوویت یونین ٹکڑے ٹکڑے ہو گئی۔ امریکہ کو ضیا الحق کی ضرورت نہ رہی اور ایک دن طیارے میں سوار 55 ''مسافروں'' سمیت ایک امریکی سفیر اور ایک بریگیڈئر کی قربانی دے کر ضیا الحق سے بھی جان چھڑالی گئی۔ ضیا الحق نے فوج کی سربراہی چھوڑ دی ہوتی تو لوگ اس کے خلاف بھی اُٹھ کھڑے ہوتے۔

صدر سوئیکارنو کا انڈونیشیا میں وہی مقام تھا جو قائداعظم کا پاکستان میں تھا اور ہے لیکن بھٹو کی اسلامی کانفرنس میں وہ بھی شریک تھا اور 65ء کی پاک بھارت جنگ میں پاکستان کی مدد کے لیے فوجی کمک بھی کی تھی۔ اس کانفرنس میں سعودیہ کے شاہ فیصل، ایران کے رضا شاہ پہلوی، لیبیا کے کرنل قذافی، عراق کے صدام حسین اور شام کے صدر اسد بھی شریک ہوئے۔ ذوالفقار علی بھٹو نے ان زعما کو باور کروایا کہ تمھارے پاس اسلحہ نہیں تو کیا ہوا، جنگیں تیل کے بغیر نہیں لڑی جاتیں تیل سب سے طاقتور ہتھیار ہے۔ یکا یک ڈالر کی قوت خرید کم ہو گئی۔ شاہ ایران نے کہا مجھے تیل کے

بدلے ٹیکنالوجی چاہیے۔ پھر لوگ شاہ کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے حالانکہ نہ صرف رضا شاہ بلکہ اس کے باپ رضا خان کا ظلم بھی سہتے اور صبر کرتے آ رہے تھے۔ اپنے گھر میں بھی باپ کے سامنے بیٹا اور بیٹے کے سامنے باپ شاہ کے خلاف بات نہیں کرتا تھا کہ مبادا ان میں سے کوئی ایک ساوک سے تعلق رکھتا ہو۔ انقلاب کی رہبری کے لیے درویش صفت آیت اللہ روح اللہ خمینی کو بلوایا گیا۔ آیت اللہ خمینی رضا شاہ کے سفید سنگ مرمر کے محل میں آ کر نہیں رہے نہ اس کے باپ رضا خان کے سرسبز سنگ مرمر کے محل میں بسیرا کیا بلکہ تہران کے مضافات میں ایک گاؤں کی دس بارہ فٹ چوڑی بند گلی کے آخر میں مٹی کے ایک چھوٹے سے گھر میں جو چار کمروں سے زیادہ نہیں تھا اور صحن بھی تنگ تھا، رہائش اختیار کی۔ راقم الحروف نے رضا شاہ کا اور اس کے باپ کا محل اور قلندر صفت آیت اللہ خمینی نے کا گھر بچشم خود دیکھا ہے۔ تہران سے باہر ایک وسیع و عریض رقبے پر پھیلے باغ میں آیت اللہ خمینی کا مزار بھی۔ خمینی نے امریکہ کو شیطان بزرگ (ابلیس) کہا تھا۔

پاکستان کو توانائی کے لیے تیل اور گیس کی اشد ضرورت ہے۔ ایران برادر پڑوسی ملک ہے۔ ہمیں یہ دونوں چیزیں سستی فراہم کر سکتا ہے نہ بھی کرے تو بھی سستی پڑ سکتی ہیں کہ کارگو شپس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ پائپ لائن بچھائی جا سکتی ہے لیکن ہم نہیں خرید سکتے۔ امریکہ نے ایران پر پابندیاں لگا رکھی ہیں۔ ہم ایک مقروض قوم ہیں اور گرے لسٹ میں بھی اور پھر افغانستان میں امریکہ کی ذلت آمیز شکست کے امریکہ کی نظر میں ذمہ دار بھی اور پابندیوں کے خطرے سے دوچار بھی، ایرانیوں کی طرح سر اٹھا کر جینے کے متحمل نہیں ہو سکتے کہ ایران مقروض نہیں ہے۔ غیر مطمئن عناصر ایران میں بھی موجود ہیں، وہ جو شاہ کے زمانے میں جرمنی جا کر لنچ کیا کرتے تھے اور وہ بھی جن کے لیے روزانہ جرمنی سے لنچ آتا تھا، ایران اپنے پڑوسی ملکوں کے مقابلے میں اپنے عوام کے لیے مہنگا ترین ملک بن چکا ہے۔ ریال کوڑی کے برابر ہو چکا ہے لیکن عوام اللہ کے بھروسے پر جی رہے ہیں۔ افغانستان میں طالبان کی حکومت امریکہ کو پسند نہیں، ان کو زر مبادلہ کی ضرورت ہے افغانستان کے اکاؤنٹس منجمد، مسلمان ممالک میں یہ جرأت نہیں کہ افغانستان کی موجودہ حکومت کو امریکہ کی اجازت کے بغیر تسلیم کریں۔ سارے مسلمان ممالک ہماری طرح مقروض تو نہیں۔ سارے کے سارے غریب بھی نہیں لیکن ''جمہوریت'' سے ڈرتے ہیں۔ ''جمہوریت'' کے نام پر امریکہ کھیل کھیل سکتا ہے۔ لیبیا میں، عراق میں، شام میں، سعودیہ میں، یمن کے حوثیوں کی صورت

میں وارننگ کے طور پر بہت کچھ کر چکا اور بہت کچھ کر سکتا ہے۔ انڈونیشیا میں صدر سوئیکارنو کا وہی مقام تھا جو ہمارے لیے قائداعظم کا ہے۔ صدر سوئیکارنو کا تختہ جنرل سارتھ نے الٹ دیا اور 32 سال تک ڈکٹیٹر رہا۔ وہاں کے عوام کو امریکہ کے نزدیک جمہوریت کی ضرورت نہیں تھی۔ کوئی تحریک نہیں چلی، رہا پاکستان تو نو سال تک سرزمین بے آئین رہا۔ گورنر جنرل تاج برطانیہ کا نمائندہ تھا۔ اس اعزاز سے محرومی کا سوچا کسی کو گوارا نہ تھا۔ جب پاکستان بنا تو اس وقت سوویت یونین کا وزیراعظم سٹالن تھا اور پاکستان کے وزیر اعظم نوابزادہ لیاقت علی خان تھے۔ ایران میں پاکستان کے سفیر راجہ غضنفر علی خان جس وقت سفارت کے فرائض انجام دے رہے تھے ایران میں سوویت یونین کا سفیر سٹالن کا قریبی دوست تھا۔ پاکستان کے سفیر سے کہا گیا کہ سوویت سفیر کے تعاون سے پاکستان کے وزیراعظم کو سرکاری دورے کا دعوت نامہ بھجوائے۔ دعوت نامہ مل گیا تو اس کی بھنک امریکی سفیر کے کان میں بھی ڈال دی گئی۔ سوویت یونین اور امریکہ میں ان بن تو تھی امریکہ کی طرف سے ہمارے نوابزادہ صاحب کو دورے کی دعوت مل گئی۔ نوابزادہ صاحب امریکہ کے دورے پر روانہ ہو گئے۔ سٹالن اپنی توہین پر برافروختہ ہو گیا۔ کشمیر کے مسئلے پر پاکستان کے موقف کا حامی تھا، اس کے بعد کشمیر پر یو این او میں قراردادوں کو ویٹو کرنے لگا۔ ہمیں انگریزوں کے ہمارے سر سے اٹھا لینے کے بعد نئے آقا کی تلاش تھی جو امریکہ کی صورت میں مل گیا۔ امریکی بھی تو برطانیہ سے ہی گئے تھے۔ امریکہ کے خلاف کوئی بات منہ سے نکالنا پاکستان کے خلاف بولنے کے مترادف تھا۔ امریکہ کو انگریز کی طرح ہمارے سروں پر بیٹھ کر حکومت کرنے کی ضرورت تھی، سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی سے سات سمندر پار سے بھی ہماری حرکات وسکنات پر نظر رکھ سکتا ہے۔ سچ کہا تھا ندیم نے:

بے وقار آزادی ہم غریب ملکوں کی
سر پر تاج آزادی بیڑیاں ہیں پاؤں میں

اور تو اور ہمارے کچھ مذہبی رہنما بھی امریکہ کی بولی بولنے لگے اگرچہ نادانستگی میں، ان کی نیت میں شک نہیں کیا جا سکتا کہ مارکس نے بھی فائر باخ کے اس کہے کی کہ مذہب افیون ہے، تائید کی تھی۔ مارکس نے فائر باخ (Feuerbach) کی تصنیف The essence of christianity پڑھ رکھی تھی اور فائر باخین بھی تھا۔ ظاہر ہے کہ ریجن سے فائر باخ کی مراد عیسائیت ہی تھی جو پورے یورپ کا مذہب تھا۔ چونکہ عیسائیت بھی مذہب ہے اور اسلام بھی مذہب ہے اس لیے عیسائیت پر حملہ اسلام پر حملے کے مترادف ٹھہرا امریکہ مذہب کا محافظ

باور کیا جانے لگا حالانکہ خود امریکہ بھی مذہب سے اتنا دور ہے جتنا سوویت یونین دور تھا۔ پاکستان توانائی کے بحران سے نمٹ سکتا ہے۔ اس کے پاس سندھ اور بلوچستان کی طویل ساحلی پٹی موجود ہے پون چکیاں لگا کر بجلی پیدا کی جاسکتی ہے۔ دھوپ سارا سال رہتی ہے۔ سولر انرجی سے بھی وافر مقدار میں انرجی حاصل کی جاسکتی ہے تیل کی ضرورت بھی کم کی جاسکتی ہے۔ کروڑوں ٹن کچرے سے بھی بجلی پیدا کی جا سکتی ہے۔ کئی یورپی ممالک کر بھی رہے ہیں۔ جرمنی نے پچاس سال بعد پیدا ہونے والے توانائی کے متوقع بحران سے نمٹنے کے لیے افریقہ کے صحرائے اعظم میں سولر انرجی کے لیے بات چیت شروع کر رکھی ہے۔ جرمنی میں سال میں کل 33 دن دھوپ ہوتی ہے۔ پاکستان میں ابتدا سے دو مسئلے حل طلب چلے آ رہے ہیں۔ ایک نفاذ اسلام اور ایک اردو کا نفاذ۔ سردار عبدالقیوم جب آزاد کشمیر کے وزیر اعظم تھے تو انھوں نے ایک بستی کو پانی فراہم کرنا چاہا تو وہاں کے لوگوں نے کہا ہمیں پانی نہیں اسلام چاہیے باقی مسئلے خود بخود حل ہو جائیں گے۔ قصور لوگوں کا نہیں تھا ان زعما کا تھا جنھوں نے اسلام کو ہر تکلیف کے لیے امرت دھارا کے طور پر پیش کر رکھا تھا۔ صدر ضیاالحق نے بھی اسلام تھوڑا بہت نافذ کیا تھا، کوڑوں کی صوت میں اور دفاتر میں اور مساجد میں بھی نماز کی حاضری لازمی ٹھہرا کر، البتہ مجرموں کو جو کوڑے لگائے جاتے تھے اسلامی کوڑے نہیں تھے انگریزی کوڑے تھے جو قیدیوں کو جیل میں مارے جاتے ہیں۔ بابائے اردو عبدالحق کی ایک تحریر میں آیا ہے کہ اطبا کا نسخے میں یہ لکھنا کہ حلسیت کا ضماد کرو، اردو نہیں بلکہ ہینگ کا لیپ کرو اردو ہے۔ حلسیت اور ضماد عربی کے الفاظ ہیں جبکہ ہینگ اور لیپ ہندی ہے۔ سید سلمان ندوی نے 'نقوش سلیمانی' میں ایک مقالے میں لکھا ہے اردو ہندی کا جھگڑا رسم الخط کا جھگڑا ہے، دیوناگری رسم الخط اور فارسی رسم الخط کا، زبان کا نہیں۔ بات بھی یہی ہے۔ جان گلکرائسٹ نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو جو زبان سیکھنے پر آمادہ کیا اس کو ہندوستانی کہا۔ مسلمانوں نے اسی زبان کو اردو کہا حالانکہ بیرونِ ہندوستان سے آنے والے فارسی زبان مسلمانوں نے اس کو ریختہ (گری ہوئی) کا نام دے رکھا تھا۔ مسلمانوں نے جو لوکل تھے اسے اردو کا نام دیا۔ مولوی عبدالحق بھی اسے اردو کہتے ہیں۔ اردو، اُردا، ترکی اور منگولی زبان کے الفاظ ہیں۔ سیر اُردا (Golden Horde) اس لشکر کا نام تھا جس نے چنگیز خان کے پوتے باطوخان کی ماتحتی میں مشرقی یورپ کو روند ڈالا تھا۔ اس وقت سے horde کا لفظ یورپی زبانوں میں شامل ہے۔ مولوی عبدالحق کو چاہیے تھا کہ اردو کو سینا کہتے۔ فوج

اور لشکر بھی موزوں الفاظ نہیں تھے۔ سر سید کے مخالفین میں وہ لوگ سب سے آگے تھے جو انگریزی زبان کے اور جدید علوم کے خلاف تھے۔ اکبر الہ آبادی بھی انہی میں سے ایک تھے:

بی اے کیا نوکر ہوئے پنشن ملی اور مر گئے

اور

کھا ڈبل روٹی کلرکی کر خوشی سے پھول جا

....

قسم کے طنزیہ وار کرتے رہے۔ اپنے بیٹے میاں عشرتی کو لکھا:

کیک کو چکھ کے سویوں کا مزہ بھول گئے

....

اکبر الہ آبادی نے کیک کو مغربی تہذیب کی علامت اور سویّوں کو مشرقی تہذیب کی علامت کے طور پر لیا۔ انہیں معلوم نہیں تھا کہ کیک روٹی کی وہ قسم ہے جسے فارسی میں کاک کہتے ہیں اور عربی میں کعک اور کاک کیک کا مفرس نہیں ہے اور نہ کعک، کیک کا معرب۔ اقبال نے 'اسرار و رموز' میں منبر کاک ایک شعر میں استعمال کیا ہے اور حاشیے میں یہ لکھا ہے منبر کاک وہ تختہ ہے جس پر روٹیاں رکھ کر بیچی جاتی ہیں۔ روٹیوں سے مراد کاک ہی ہے نہ کہ نان۔ یحییٰ بن احمد الاندلسی (وفات، ۴۴۷ھ) کے ان دو شعروں میں کعک کا لفظ موجود ہے:

لا تکونن مغرما و عشوقا
سلة أدما وخلّ عنك الرغيفا
أکرم الخبز بالصیانة حتی
یجعل الکعك للبنات شغوفا

خبز، رغیف اور کعک تین مختلف قسم کی روٹیوں کے نام آگئے۔ عربوں نے کیک بنانا خراسانیوں سے سیکھا اور خراسانیوں نے یونانیوں سے اور یونانیوں نے اہل مصر سے، کیک انگریزی زبان کا لفظ نہیں قدیم مصری قبطی (Coptic) زبان کا لفظ ہے۔ کیک کھانا پیغمبروں کی سنت ہے کہ حضرت موسیٰ فرعون کے محل میں کیک کھا کر بڑے ہوئے تھے اور حضرت یوسفؑ بھی کیک کھاتے رہے زلیخا کے ہاتھ کے بنے ہوئے بھی اور خود بھی بنا لیتے رہے ہوں گے۔ خواب میں جس قیدی کے سر پر روٹیاں رکھی دیکھی ہوں گی کیک ہی ہوں گے چپاتیاں نہیں ہوں گی۔ کیک کا سفر بنی آدم کی تہذیب اور تہذیب کی تاریخ کا سفر ہے۔

معلوم نہیں کسی کی دعا کا نتیجہ تھا یا اکبر الہ آبادی کو خود ہی احساس ہوا کہ

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا ہے

....

سر سید نے دو کام کیے، انگریزی زبان اور جدید علوم کے حصول کی ترغیب دلائی اس کے لیے ایک عظیم الشان تعلیمی ادارے کی بنیاد رکھی۔ دوسرے اردو کو علمی زبان بنانے کے لیے کام کیا۔ اس کام کی طرح جان گلکرائسٹ نے ڈالی تھی۔ سر سید نے اسی کے کام کو آگے بڑھایا۔ قبل ازیں فارسی سکھوں تک کی سرکاری زبان تھی۔ انگریزی کی مخالفت سر سید کے زمانے میں بھی ہوئی

کہ سرسید انگریزی سکھا کر لوگوں کو کرستان بنانا چاہتا ہے اور آج بھی ہو رہی ہے اور اردو والے ہی کر بھی رہے ہیں۔
گھر میں پرویز کے شیریں تو ہوئی جلوہ نما
لے کے آئی ہے مگر تیشۂ فرہاد بھی ساتھ

....

عربی فارسی دینی مدارس تک محدود، انگریزی غیروں کی زبان، اردو ہماری قومی زبان، انگریز انگریزی اپنی قومی زبان میں، فرانسیسی اپنی قومی زبان میں، جاپانی، چینی، جرمن اپنی اپنی قومی زبانوں سائنس پڑھ کر ترقی کر سکتے ہیں تو ہم کیوں نہیں کر سکتے۔ ایسا سوچتے وقت ہم یہ بھول جاتے ہیں کہ جن زبانوں کی مثالیں دی جا رہی ہیں وہ ان قوموں کی مادری زبانیں بھی نہیں۔ ایران میں فارسی زبان وادب وہ شخص نہیں پڑھا سکتا جو عربی نہیں جانتا، ایسا شخص ڈسکو الیفائڈ ہے۔ اردو زبان وادب پڑھانے کے لیے خود اردو جاننے کی بھی ضرورت نہیں۔ عربی فارسی کو دیس نکالا ملنے کے بعد ہم پوری مسلم دنیا سے کٹ گئے، انگریزی کو دیس نکالا دینے کے بعد پوری دنیا سے کٹ سکتے ہیں ۔ زبانیں کافر اور مومن نہیں ہوتیں انہیں بولنے والے ہوتے ہیں۔ عربی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان تھی اور ابولہب اور ابوجہل کی بھی۔ پنجابی زبان مشرقی پنجاب کے سکھ بھی بولتے ہیں اور مغربی پنجاب کے مسلمان بھی۔ سکھ اسے گورمکھی رسم الخط میں لکھتے ہیں اور مسلمان فارسی رسم الخط میں۔ لیکن اس معاملے پر کبھی اس طرح کا جھگڑا نہیں ہوا، جس طرح کا جھگڑا اردو ہندی پر ہوا۔ ساری زبانیں بنی آدم کی زبانیں ہیں اور بنی آدم اعضائے یک دیگر اند۔ کسی بھی زبان سے نفرت تنگ نظری ہے۔ کیا اردو میں سائنس کی جملہ شاخوں کی تعلیم دی جا سکتی ہے؟ وہ بھی عربی فارسی سے مدد لیے بغیر۔ اردو والوں نے فرہنگ اصطلاحات بھی مرتب کر رکھے ہیں۔ اکنامکس میں ایک اصطلاح Law of deminishing utility ہے جس کا ترجمہ قانون تقلیلِ افادۂ مختتم کیا جاتا ہے، عربی میں۔ ایک اجنبی زبان کا ترجمہ دوسری اجنبی زبان میں ۔ معلوم نہیں ultra violet اور Infra red کا اردو میں ترجمہ کیا ہوگا جب حلقیت اور ضماد اردو نہیں، اردو بینگ اور لیپ ہیں۔ خود اردو بھی اردو نہیں، ترکی ہے، بتایا جاتا ہے کہ اردو کا مطلب لشکر ہے اردو لشکر بھی تو فارسی ہے۔ کیا کبھی اردو میں لشکر کو اردو بھی کہا گیا ہے۔ اردو بولیے، اردو لکھیے، اردو پڑھیے۔ کیا پڑھیے؟ آرائش محفل، قصہ چہار درویش ان میں بھی عربی فارسی بھری ہوئی ہے لے دے کے خالص اردو میں رانی کیتکی کی کہانی ہی رہ جاتی ہے ۔ پڑھیے اور سوچ جائیے۔

☆☆☆☆☆

''جی چاہتا ہے اور اندھیرا دکھائی دے''

لیاقت علی عاصم کی شاعری کے ساتھ تخلیقی شب گردی

کینیڈا کی معروف ماہرِ رقص خاتون شینن لٹسن برگر اِس بار اپنے آبائی اور انتہائی سرد شمالی صوبے سسکیچوان گئیں تو وہاں انہیں گراس لینڈ زنیشنل پارک کی سیرِ شب کا موقع بھی ملا۔ گراس لینڈز پارک کینیڈا کے ان چودہ پارکوں میں سے ایک ہے جنہیں سرکاری طور ہر ''ڈارک سکائی ریزرو'' کا درجہ حاصل ہے۔ گراس لینڈز کینیڈا میں اس نوعیت کا سب سے بڑا نہ سہی سب سے تاریک آسمان کا حامل پارک ضرور ہے۔ ۲۹۷ مربع کلومیٹر پر پھیلا ہُوا یہ وسیع میدان انسانی آبادی اور اس کے اثرات سے میلوں دُور واقع ہے۔ شینن نے دیکھا کہ شام چھ بجے تاریکی آہستہ آہستہ تاحدِ نگاہ پھیلے میدان میں اپنے پر پھیلانے لگی تھی ۔ مصنوعی اور شہری روشنیوں کی آلودگی سے پاک یہ قدرتی منظر دیکھتے ہی دیکھتے گہرا ہوتا چلا جا رہا تھا۔ پھر ستاروں کی ایک ہلکی سی تہہ نمودار ہوئی جو تھوڑی ہی دیر میں خوب روشن ہوگئی۔ پھر اس کے پیچھے ایک اور تہہ ابھرتی ہوئی دکھائی دی اور پھر --- اس کے اوپر ایک اور --- اور اس سے اوپر ایک اور --- شینن ستاروں کی پچاس تہیں گننے میں کامیاب ہوگئی تھیں۔ وسیع تاریک میدان پر چھائے گہرے نیلے آسمان سے تہہ در تہہ ستارے گویا دمکتی جھالروں کی طرح نیچے لٹک رہے تھے۔ لق و دق خاموشی اور بے کراں تنہائی کے اس خواب ناک منظر میں پرندوں کی چہکاریں اور جھینگروں کی آوازیں پس منظر موسیقی کا کردار ادا کر رہی تھیں۔ حقیقی رات کا قدرتی حُسن بیک وقت اپنی تمام تر جاذبیت، حُسن اور دہشت کے ساتھ جلوہ گر تھا۔

شینن واپس شہر ٹورانٹو پہنچیں تو گھر میں داخل ہوتے ہی سیدھی اپنی کتابوں کی الماری کی طرف لپکیں جہاں یارک

حامد یزدانی

یونیورسٹی کے انگریزی ادبیات کے پروفیسر کرسٹوفر ڈیوڈنی کی تصنیف ''شب آشنا: اندھیرا چھا جانے کے بعد دنیا کی سیر'' ان کی منتظر تھی۔ شینن نے ورق گردانی کرتے ہوئے محسوس کیا کہ کرسٹوفر نے اپنی کتاب میں جس فرضی رات کا ذکر کیا ہے اس کے کئی منظر وہ ابھی ابھی گراس لینڈز پارک میں سیرِ شب کے دوران میں دیکھ کر آ رہی تھیں۔ سانس لیتے ہوئے، دمکتے ہوئے، لبھاتے ہوئے اور ڈراتے ہوئے زندہ مناظر؛ زندہ اور شفاف رات۔ انہوں نے کتاب ختم کی اور اس کے مندرجات کو اپنی آنکھوں اور احساس کے حالیہ تجربے سے ہم آہنگ کرتے ہوئے ایک تخلیقی رقص یعنی ''رقصانہ'' تیار کیا ''دُنیا: اندھیرا چھانے پر'' جس کی نمائش کچھ روز قبل ٹورانٹو کے واٹر فرنٹ تھیٹر میں ہوئی۔ شینن کے اس تخلیقی تجربے سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مجھے یاد آیا کہ کرسٹوفر ڈیوڈنی نے اپنی اعزاز یافتہ منفرد تصنیف کی بنیاد اعترافیہ انداز میں ممتاز امریکی شاعر رابرٹ فراسٹ کی ۱۹۲۸ء میں لکھی گئی دل کش نظم ''Acquainted with the Night'' (شب آشنا) کے ان مصرعوں پر استوار کی تھی:

I have been one
acquainted with the
night
I have walked out in
rain and back in rain
I have walked the
furthest city light

کرسٹوفر اور شینن کا پیغام یہی ہے کہ ''آئیں، اُس اصل اور حسین رات کو ڈھونڈیں جسے ہم کہیں کھو چکے ہیں''۔ جیسے ہی میں نے اپنے ان دو کینیڈین ہم وطنوں کی پکار پر لبیک کہتے ہوئے رات کے کھوج کا عزم کیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ دنیا کے مختلف خطوں اور زمانوں کے کتنے ہی فنکار اپنے اپنے غُرفۂ شب سے نظارۂ شب میں مگن ہیں۔ مگر کچھ ہی دیوانے ایسے ملے جو جھروکوں سے نکل کر رات کے دل میں اُتر جانے کی ہمت رکھتے تھے۔ حقیقی رات کی تلاش میں جو خالد احمد، امجد علی، خالد علیم، طارق کامران، عباس تابش، ضیاالحسن، امجد طفیل، اسرار وڑائچ، زاہد حسن اور زاہد حسین جیسے کتنے ہی ادبی دوست میرے ہمقدم ہوئے یا جن کا میں ہمقدم ہوا لیکن لیاقت علی عاصم صاحب کے ساتھ شب گردی کا معاملہ یکسر مختلف رہا۔ ان سے بالمشافہ ملاقات تو کبھی ہوئی نہیں تاہم ان کا نام ان کی جھلمل جھلمل شعری کائنات کے حوالہ سے ہمیشہ میرے احساس کے بہت ہی قریب دھڑکتا رہا۔ اس قربت کی فوری وجہ یہ خیال تھا کہ مجھ سے بہت سے دوسرے مُحبینِ شب کی طرح عاصم صاحب بھی اس کاروانِ شب

کے زندہ دل مسافر ہیں۔ وہ بھی شام سے اپنے شانے کو دن کے بوجھ سے آزاد کر کے راحت محسوس کرتے ہیں:

بوجھ تھا اک صبح کے آنے سے دن
شام آئی گر گیا شانے سے دن

.....

انہیں اپنے شہرِ حال سے یہ گلہ بھی رہا کہ اِدھر شام ڈھلی اور اُدھر:

محفلیں ختم ہوئیں ، حلقۂ احباب گیا

.....

اور شہر کے ایک گوشے دھیمی دھیمی سی شکایت ابھرتی سنائی دیتی:

اب تو یہ شہر سرِ شام ہی سو جاتا ہے

.....

اور اس شہر کے باسیوں کے حوالے سے عاصم صاحب کا مشاہدہ کہاں تک ہے، وہ خود بتاتے ہیں:

ہم نے وہ لوگ بھی دیکھے ہیں جو دن ڈھلتے ہی ایسے سو جاتے ہیں جس طرح کہ مر جاتے ہیں

.....

چلئے صاحب! مر جانے پر بھی کچھ اعتراض نہیں بس:

موت منظور مگر نیند تو آئے پہلے

.....

اب ایسے زندہ دل وضمیر کا کیا کیا جائے جنہیں نیند آتی ہی نہیں۔ ایسے شب زندہ دار یا تو اللہ کے ولی ہوتے ہیں یا ہجر زدہ عاشق یا پھر شاعر جو حقیقت کو خوابوں میں ڈھالنے پر مصر ہوتے ہیں، جنہیں یقین رہتا ہے کہ:

ڈوبے گا آفتاب مِری خواب گاہ میں

.....

اب خواب گاہ میں یہ آفتاب ڈوبتا ہے تو سارے کا سارا ماحول خوابیدہ ہونے لگتا ہے حتیٰ کہ:

جاگتے تھے تری تصویر کے امکاں جن میں
اب تو وہ رنگ بھی دیوار میں سو جاتے ہیں

.....

اور رنگ سو جانے کے بعد پھر شاعر دیکھتا ہے کہ:

دیوار و در میں کچھ نہیں تنہائی کے سوا

.....

انسان کا دل بھی عجیب شے ہے محفل ہو تو تنہائی چاہتا ہے اور تنہائی میسّر آجائے تو محفل کا طلب گار ہو جاتا ہے۔ جب گھر کے در و دیوار کیا یادوں کی تصویر کا رنگِ امکان بھی سو جاتا ہے تو خیال آتا ہے کہ شائد چار دیواری سے باہر سکون آور محفل ہو مگر اندر ہی اندر کوئی ڈرانے بھی لگتا ہے:

بڑا اندھیر ہے ، باہر نہ جاؤ

.....

اُسی وقت وہیں کوئی یوں بھی اُکسا رہا ہے:

آ، نکل جائیں شبِ وہم و گماں سے آگے

عجیب کشمکش ہے۔ کیسی الجھن ہے! ---مگر سفر آمادہ دل کب ٹھہرتا ہے اسے تو ازل سے ہی بے تابی نصیب ہوئی ہے۔ ہر ہر لمحہ ایک نئی جہت کا شوق، ایک نئے زمانے کی دُھن:

ہر لمحہ ایک اور زمانے کی دُھن میں ہوں
آیا ہوں جب سے میں کہیں جانے کی دُھن میں ہوں

.....

لیکن کہاں؟ اس سوال کا جواب تلاش کرنا آسان نہیں۔ دل کی بے چینی قدموں کی ہمت بن جاتی ہے اور ایک اور ان جانی منزل کی جانب سفر آغاز ہو جاتا ہے۔ ایک ایسی منزل جہاں پہنچ کر ازل کا ہجر ختم ہو جائے مگر تنہائی ختم نہ ہو۔ یہ بھلا کیسے ممکن ہے! اسی سوچ میں گم رابرٹ فراسٹ، کرسٹوفر ڈیوڈنی، شین لٹسن برگر اور لیاقت علی عاصم کے ساتھ کب میں اپنے خواب خواب گراس لینڈز پارک پہنچ گیا مجھے پتہ ہی نہیں چلا۔ داخلی دروازے پر ہی رات ہم سے پوچھتی ہے کیا ہم ایک دوسرے سے پہلے مِل چکے ہیں؟ مجھے تو کچھ سوجھتا نہیں ہاں عاصم صاحب جواب دیتے ہیں:

ہم تم ستارہ وار ملے تھے زمین پر
شاید یہ آسمان سے پہلے کی بات ہے

.....

داخلے کی اجازت مل جاتی ہے۔ کیا دیکھتا ہوں کہ آسمان کی گہری سیاہی مائل چادر ہمارے سروں پر تنی ہے دور دور تک جہاں تک ہماری بینائی کی دسترس ہے وہاں تک۔ اور اس چادر سے آویزاں جگمگاتے ستاروں کی جھالریں ڈھلک ڈھلک پڑ رہی ہیں۔ تہہ در تہہ، لڑی لڑی جھولتے ستارے۔ رات اور ہم۔ لطف کی بات یہ کہ ہم سب یہاں ہیں، اکٹھے ہیں اور تنہائی بھی ہے۔ عجیب بات ہے ناں۔ عاصم صاحب کو اس پر کچھ حیرت نہیں ہوتی۔ کہتے ہیں:

یہ کوئی بھیڑ نہیں، مجمعِ تنہائی ہے

.....

اور میری حیرت کو درخورِ اعتنا نہ جانتے ہوئے اپنی ہی دُھن میں کہے جاتے ہیں:

ستارے تو نکلتے ہیں، یہ تنہائی تو ہوتی ہے
کوئی آئے نہ آئے بزم آرائی تو ہوتی ہے

.....

ستارہ آرا اس بزم میں کبھی تو ہمیں ایسا لگتا ہے کہ یہ ستارے اتنے قریب ہیں کہ بس ہاتھ بڑھائیں گے اور انہیں چھو لیں گے اور کبھی لگتا ہے کہ یہ ناممکن ہے۔ اسی کشمکش میں دلِ حسرت زدہ کہہ اٹھتا ہے:

ستارے ٹوٹ کے دامن میں آ نہیں سکتے!

.....

دل حسرت میں جانے کیا کشش تھی کہ یک دم ایک ستارہ نیلگوں فلک سے دامنِ دل کی طرف لپکنے لگتا ہے:

ہاتھ بے ساختہ پھیلا دیئے اس کی خاطر
اور کیا کرتا میں ٹوٹے ہوئے تارے کے لیے

اب دل میں امید زندہ ہو جاتی ہے اور کوئی کہتا ہے:

ابھی تو بس اک ستارے ہی سے نظر لڑی ہے، دل فسردہ
ابھی تو اس نیلگوں مکاں میں بہت دریچے پڑے ہوئے ہیں

.....

جی ہاں، یہ تو شب بافگی کا پہلا مرحلہ ہے۔ وقت کی چاپ کا احساس تک بھی نہیں۔ رات بھیگ چکی۔ وقت پوچھئے بھی تو جواب آتا ہے:

آج بھی بند ہے گھڑی شاید
رات کے بج رہے ہیں پونے دو

.....

گھڑی چاہے بند تو وقت تو بہر حال چل رہا ہے اور منزل، اگر کوئی ہے تو، بہت دور ہے۔ زمین سے آسمان تک اور آسمان سے زمیں تک سفر در سفر۔ در بہ در دریچہ، راہ در راہ۔ دیکھئے تو:

زمیں سے تا بہ فلک راستہ بنا ہوا ہے

.....

اپنے اردگرد نگاہ کرتے ہیں تو کوئی دیا نہیں، کوئی چراغ نہیں۔ کوئی مصنوعی کرن نہیں جو ہے سب اصلی ہے، فطری اور قدرتی ہے، معصوم ہے، خالص ہے۔ خالص اور سچا اندھیرا۔ ایک شفاف اور گہری تاریکی جو دن کے تصنع اور اس کی روشنی کی آلائش سے قطعی پاک ہے۔ ایسی نعمت کو کون جھٹلائے! کہتے ہیں نعمتیں بانٹنے سے بڑھتی ہیں۔ اسی لیے عاصم صاحب بڑے اعتماد سے کہتے ہیں:

یہ بد دعا نہیں ہے کہ ہو تو بھی بے چراغ
جی چاہتا ہے اور اندھیرا دکھائی دے

.....

کیونکہ دن کا دھندلا شیشہ قدرت کے وہ حقیقی رنگ اجاگر نہیں کر پاتا جو رات کے شفاف آئینے میں جلوہ گر ہوتے ہیں:

جو روشنی میں ترے خدوخال میں گم تھے
دکھا دیئے ہیں وہ سب رنگ تیرگی نے مجھے

.....

بصارت کو رات میں صرف سیاہی دکھائی دیتی ہے مگر بصیرت کو فطرت کی ایسی رنگا رنگی کا میلہ دکھائی دیتا ہے جس میں محفل اور تنہائی اپنے انفرادی وجود اور اپنی حدود کی ظاہری قیود سے آزاد ہو جاتی ہیں۔ اردگرد سے بے پرواہ شب زندہ دار درویش کی طرح ایک دھمال کی وارفتگی میں کھو جاتی ہیں۔ کائنات کے محور میں تکوین کے کے مدار پر دائرہ دائرہ گھومتی چلی جاتی ہیں۔ ہوش میں آنے پر اکثر کچھ یاد نہیں رہتا ہاں اردگرد کھنچا دائرہ کچھ احساس سا جگاتا ہے کہ:

ہمارے ساتھ کوئی رقص کر چکا ہے یہاں
ہمارے گرد کوئی دائرہ بنا ہوا ہے

.....

کس نے کس کے ساتھ رقص کیا، کیوں کیا، کب تک کیا کچھ کسی پر کچھ کھلتا نہیں۔ ازل کے رموز سے اسرار معراج کی اسرار تک

کائنات کا رقص الست کی کس تال پر ہوا سب بھید رات نے اپنے سینے میں چھپا رکھے ہیں۔ رات تاریکی کی چادر اوڑھے خدا مست صوفی کی طرح مست ہے۔ اپنی بُکل ہر کسی کے سامنے کھولتی نہیں۔ سو رات بھی چپ ہے اور ہم مسافرانِ شب بھی خاموش ہیں اور یوں:

دونوں جانب کی خاموشی
بات مکمل کر دیتی ہے

.....

بات مکمل کرنا اب ضروری بھی ہے کیونکہ صبح کے اجالے ساتھ اس مجمعِ تنہائی کو منتشر ہو جانا ہے:

صبح دم کوچ کا ارادہ ہے
بات کرلو کہ رات باقی ہے

.....

رات کے دل پزیر مناظر سے ہم کلامی میں رات کب بیت گئی کچھ احساس ہی نہیں ہوا۔ ذہن سوچ رہا ہے:

رات گزری مگر کہاں گزری!

.....

خیر وہ تو بھلا ہو لیاقت علی عاصم صاحب کا جو ''میں صاحبِ کمال ہوں عہدِ زوال کا'' اعلان کرتے ہوئے کہہ رہے ہیں:

جمع سب رات کا شیرازہ کرو، صبح بخیر

.....

دل پھر بھی اس ملاقات شب کے اختتام کی حقیقت کو قبول کرتا دکھائی نہ دیتا۔ اس کا کہنا ہے کہ:

اس ملاقات کا انجام نہیں ہے کوئی

.....

سو صبح ہوتے ہوتے یہ خواب خواب ملاقات بھی بکھر ہی گئی۔ ہر سفر ختم ہو جاتا ہے اور ہر آغاز اپنے انجام سے آشنا ہو کر رہتا ہے۔ لیاقت علی عاصم کہتے ہیں:

رات اک خواب بکھر جاتا ہے ان آنکھوں میں
صبح اک پھول سجا لیتا ہوں بستر کے قریب

.....

سوچتا ہوں خواب کے اس بکھرتے پھول کی خوشبو بھی یہاں کتنوں کو نصیب ہے! اور ہو بھی کیسے سکتی ہے یہ کوئی معمولی اور عارضی خواب تو ہیں نہیں:

ہمارے خواب ہیں صدیوں کی داستان لیے

.....

داستان اور رات کا رشتہ کون نہیں جانتا۔ الف لیلہ کی حکایات سے لے کر عالمی جنگوں کی روایات تک دونوں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، شانے سے شانہ ملائے۔ اور پھر یہ صدیوں کی داستاں دامن میں سمیٹے خواب کن خوش نصیب آنکھوں کے حصے میں آتے ہیں! کون جانے۔ ہماری آنکھوں کو خواہش کی توفیق ملتی تو ایسی خوش نصیبی کی خواہش ضرور کرتیں۔

☆☆☆☆☆

قضا روحی_ احوال و آثار

قاضی محمد عمر خان جو شعر و ادب کی دنیا میں قضا روحی کے نام سے معروف رہے، اردو کے نامور شاعر داغ دہلوی کے شاگرد تھے۔ وہ اردو شاعری میں قضا جب کہ فارسی کے لیے روحی تخلص کرتے تھے ۔ وہ صوبہ خیبر پختونخوا کے ان اہلِ علم و ادب میں شامل تھے جنہوں نے انگریز سامراج کیخلاف قلمی جہاد میں حصہ لیا اور تاریخِ سرحد میں ایک روشن باب رقم کیا۔ وہ صوفی منش اور طریقت کے رموز سے بھی آگاہ تھے اور برہان کے سجادہ نشین کے مرید بھی تھے۔ علم و ادب سے شغف کا یہ عالم تھا کہ سیکڑوں کی تعداد میں قیمتی اور نادر کتابیں ان کی ذاتی لائبریری میں موجود رہیں۔ اقبال، سردار عبدالرب نشتر، زیڈ اے بخاری، برق کوہاٹی، غنی خان، حسرت موہانی، جگر مراد آبادی، علامہ تاجور نجیب آبادی، سیماب، جوش، شوکت میرٹھی، طباطبائی، جلیل مانک پوری، گرامی، بیخود دہلوی، مولانا اصغر علی روحی، مولانا سراج الدین سائل اور کئی دیگر معروف شعرا، ادیب ان کے ہم عصر تھے۔

قضا روحی کے والد کا نام قاضی عبدالرحیم کرنالوی تھا۔ اُن کی اولاد میں تین بیٹوں کا تذکرہ ان کی بیاض میں موجود ہے جن میں قاضی ناصر الدین سلیم، قاضی مصباح الدین سلیم اور سلیم اقبال احمد شامل ہیں۔ وہ 1881ء میں پیدا ہوئے جبکہ 17 مئی 1957ء کو جہان فانی سے کوچ کے لیے رختِ سفر باندھ لیا۔

قضا روحی کی زندگی کے حوالے سے کوئی مستند تحریر تو موجود نہیں لیکن اُن کی بیاض میں، ریڈیو سٹیشن کی طرف سے غالباً ۱۹ جون ۱۹۴۶ء کو انٹرویو کی غرض سے بھیجا گیا سوالنامہ اور اس کے جوابات درج ہیں، جن سے اُن کی زندگی کے بعض گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔ قضا

خورشید ربانی

صاحب نے سوالوں کے ترتیب وار جواب دیے ہیں۔ اپنی عمر اور ابتدائی زندگی سے متعلق پوچھے گئے سوال پر لکھتے ہیں کہ "میری عمر ایک نہیں دو ہیں، اور میں وہ دونوں عرض کیے دیتا ہوں۔ کرنال میں ایک بوڑھے جوتشی سے یارانہ ہو گیا تھا، تو عمری کا زمانہ تھا، زائچہ بنوانے کا شوق ہوا۔ والد صاحب سے تاریخ پوچھی، فرمایا چار شنبہ، ۹ مارچ ۱۸۸۴ء، زائچہ بنا مگر زائچہ نے مستقبل کے کسی واقعہ سے مطابقت نہ کی۔ میں نے خیال کیا کہ والد صاحب نے مصلحتاً تاریخ غلط بتائی۔ قرنوں بعد اُن کے متروکات سے کچھ کاغذ میرے ہاتھ آئے جن میں میرا سالِ پیدائش ۱۸۸۱ء درج تھا۔ اب اگر دونوں تاریخیں صحیح ہیں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ میں نے دو مرتبہ جنم لیا اور یہ کوئی بری بات بھی نہیں کہ خدا کے بندوں میں روزانہ جنم لینے والے بھی ہیں۔ دور کیوں جایئے، میرے استاد ہی کو لیجیے، فرماتے ہیں:

روز جیتا ہوں روز مرتا ہوں
زندگی کا کوئی حساب نہیں

.....

میں بہت چھوٹا تھا کہ جے آر ڈامنڈ ڈپٹی کمشنر کرنال کے کہنے پر والد صاحب نے مجھے علی گڑھ بھیج دیا۔ تعطیلاتِ موسمِ گرما میں گھر آیا تو پھر جانا نصیب نہ ہوا۔ یہ جملہ معترضہ ہوگا کہ علی گڑھ میں سرسید اور مسٹر محمود کی زیارت کا دو مرتبہ اتفاق ہوا، وہ گئے اور نقش چھوڑ گئے۔ بچپن کے نقوش ہمیشہ تازہ رہے"۔ (۱)

قاضی صاحب نے اپنے والد سے بہت سی کتابیں پڑھی ہیں۔ اپنی کتب بینی سے متعلق لکھتے ہیں کہ "مولوی عبدالرحیم صاحب بورڈ ہائی سکول کرنال میں مدرس اول تھے، میں نے سکول میں بھی اُن سے پڑھا اور سکول چھوڑنے پر گھر میں بھی۔ مولوی صاحب شعر بھی کہتے تھے اور اثر تخلص کرتے۔ ان کے فیضانِ صحبت میں میرا شوق عشق بن گیا۔ یعنی وہ ضرورت پر لکھتے اور میں بلا ضرورت لکھتا۔ میں نے دساتیر، اُن سے پڑھی اور اُسے پڑھ کر پارسیوں کی مذہبی کتابوں کی لَو لگی۔ میں نے مولانا شبلی کو خط لکھا اور ان کی نشاندہی پر بہت سی کتابیں منگوائیں"۔ (۲)

اس سوالنامے میں مشاغل کے بارے میں پوچھے گئے سوال پر لکھتے ہیں کہ "کتاب، شطرنج، شعر اور زین سواری میرے شوق رہے ہیں۔ زین سواری کرنال میں ختم ہوئی۔ شطرنج یہاں (پشاور) آنے کے بعد، کتاب اور شعر، یہ دو شغل باقی ہیں۔ شاعری کا آغاز ۸۴ کی رو سے گیارہ جب کہ ۸۱ کی رو سے ۱۴ سال کی عمر میں ہوا۔ داغ ہی نہیں غالب سے بھی تلمذ رہا ہے۔ افسوس کہ معنوی رنگ اُن حضرت کا زمانے کی بے رنگی میں گم ہوا، یہی روزِ بد غالب کو بھی دیکھنا پڑا۔ یہ طالبانِ غالب کی خوش نصیبی کہ وہ نسخہ، اطباق الذہب، ایک رئیس کی مہربانی سے اُن تک پہنچا ورنہ مصنف تو دفترِ بے معنی سمجھ

کر غرقِ مئے ناب کر ہی چکے تھے۔ کہیے میری کہ میں نے اسی قسم کے اڑھائی ہزار سے اوپر اشعار کا مجموعہ نذرِ آتش کیا اور وہ اس لیے کہ "المعنی فی بطنِ الشاعر" کو آگ ہی پہنچ سکتی ہے۔ اب باوجود احتیاط اگر کوئی شعر اسی قبیل کا دماغ سے تراوش کرتا ہے تو مطلب نوٹ کر لیتا ہوں۔ یہ بھی کہہ دوں کہ استاد (داغ) نے ۹ نومبر ۱۹۰۰ء سے ۱۹۰۱ء تک میری گیارہ غزلیں دیکھیں، بعد ازاں تعلیمی مصروفیت سے یہ سلسلہ موقوف ہو گیا"۔(۳)

قضا روحی نے اگرچہ اپنی شاعری کا "الدیوان" کے نام سے ایک مسودہ ترتیب دے رکھا تھا مگر اپنی زندگی میں اسے شائع نہ کر سکے تاہم اُن کی شاعری زمانے کی گرد میں گم ہو جانے کے بجائے اُن کے چاہنے والوں کے دل میں زندہ رہی۔ اس کی ایک زندہ مثال یہ ہے کہ اُن کی رحلت کے کئی دہائیوں بعد، جب میں نے ایک ملاقات میں نامور شاعر ڈاکٹر توصیف تبسم سے اُن کا ذکر کیا تو انہوں نے فوراً ان کے ساتھ ملاقاتوں اور ان کی ایک معروف غزل کا تذکرہ کیا اور ایک خوبصورت شعر بھی سنایا:

ہر قدم پر ہیں یہاں جام و سبو
آپ ٹھوکر نہ کہیں کھایئے گا

مجموعہ کلام "الدیوان" کی ترتیب اور یہ نام رکھنے سے متعلق ۹ ستمبر ۱۹۵۰ء کو انہوں نے اپنی بیاض میں لکھا کہ "نام اس مجموعے کا قاضی کی رعایت سے "الدیوان" میں نے رکھا ہے۔ متنبیانہ، تصنع اور تعلّی کو اس میں دخل نہیں ہے"۔(۴)

قضا روحی کی شخصیت کے حوالے سے نامور شاعر رضا ہمدانی لکھتے ہیں کہ "قضا مرحوم کی بڑی سنجیدہ، قلندرانہ مزاج اور وضع دار شخصیت تھی۔ ہر وقت لیے دیے رہتے تھے۔ نسلاً یوسف زئی پٹھان تھے مگر وضع قطع، شباہت اور لباس سے ہندوستان کی کسی ریاست کے نواب لگتے تھے۔ گھر ہو یا محفل ان کی نشست گاہ میں ہر وقت شعرا و اہلِ علم کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ اس جمِ غفیر کے درمیان گدی اپنی مسند پر بیٹھے گل افشانی کرتے رہتے۔"(۵)

اپنے قلندرانہ مزاج کے حوالے سے اپنی ایک غزل "مری تقدیر میں ہیں ناخنِ تدبیر کے ٹکڑے" کی ابتدا میں لکھتے ہیں کہ "میں نے کرنال میں بہت عمر گذاری ہے، یہ وہیں کا فیضان ہے کہ کبھی کبھی شانِ قلندری آ جاتی ہے"۔(۶)

قضا روحی کی شاعری کلاسیکی روایت سے جڑی ہوئی ہے۔ اگرچہ وہ داغ دہلوی سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے لیکن طبعاً مشکل پسند تھے اور غالب کی تقلید کرتے تھے۔ شعر لکھتے ہوئے ایک ماحول بناتے اور پھر اس کی نوک پلک سنوارتے رہتے۔ معروف شاعر رضا ہمدانی کو ان سے قربت کا اعزاز

رہا وہ لکھتے ہیں ''شعر گوئی میں ان کا طریق کار بڑا دل چسپ تھا۔ سامنے رکھی ہوئی تپائی پر سلیٹ رکھی ہوتی اور ابتدائی ہیولا اسی سلیٹ پر بنتا جس کی نوک پلک بعد میں سنوار لی جاتی''۔(۷)

زود حس بھی تھے اور اس بات کا ذکر بھی اپنے مجموعۂ کلام کے پیش لفظ میں یوں کیا ''طبیعت میں حس زیادہ ہے۔ اس لیے پریشان بھی زیادہ رہتا ہوں۔ کہنا یہ ہے کہ جو کہتا ہوں، پریشانی سے خالی نہیں ہوتا''۔(۸)

سنجیدہ شعرا کی طرح ان کے ہاں بھی غزل کہنے کے بعد کئی دن تک قطع و برید جاری رہتی۔ اپنے دیوان کے پیش لفظ میں لکھتے ہیں ''میں وسط اکتوبر ۱۹۱۰ تک کرنال میں تھا۔ وہاں کا کہا ہوا سب ''ھباً منثوراً'' ہوا۔ دو چار غزلیں اس ابتلا سے بچ رہیں، ان میں بھی ردوبدل ہوتا رہا''۔(۹)

اپنی بیاض میں ہر غزل کے ساتھ تاریخ تخلیق لکھنا وہ کبھی نہ بھولے۔ اکثر غزلوں کے ساتھ درج ہے کہ یہ طرحی مشاعرہ کے لیے لکھیں، وہ بعض الفاظ کے معنی اور تراکیب کی وضاحت بھی ساتھ ساتھ یادداشت نوٹ کی صورت درج کرتے رہے اور تاریخ تصنیف بھی۔ اس مجموعہ کی اولین غزل کے حاشیہ میں لکھتے ہیں ''یاں'' اور ''پہ''، پرانے سکوں میں سے یہ دو سکے میرے اس خزانے میں شامل رہے ہیں۔ پہلا تواتر کے ساتھ اس غزل میں، پچھلا انفراداً ان دونوں شعروں میں:

مانا کہ خدا بھی ہے دعا بھی ہے کوئی چیز
پہ درد یہ کہتا ہے دوا بھی ہے کوئی چیز

....

تری ہر بات ہے نقشِ نگیں، پہ کیا کروں دل کو
نہیں، تیری نہیں کچھ دل نشیں معلوم ہوتی ہے

....

صاحب نفائس نے یہ بے پر کی اڑائی ہے کہ پہ کو فارسی بتایا ہے اور سند میں وحشی کا شعر دیا ہے۔ ساتھ ہی اپنی بے اطمینانی بھی ظاہر کی ہے۔ ولیکن ذالک لا الیٰ ھو۔ میں نے وحشی کا دیوان دیکھا ہے اس میں یہ غزل ہی نہیں''۔(۱۰)

ایک اور غزل جس پر ۱۹ مئی ۱۹۲۸ء کی تاریخ درج ہے اور جس کی ردیف ''صحرا'' اور قافیہ ''یادگار، غبار، مزار'' وغیرہ ہے، کے بارے میں لکھتے ہیں ''میں پنڈی میں تھا۔ بہن ایک خوشی کی تقریب میں کشمیر سے آئیں۔ چند گھنٹے میرے پاس ٹھہریں اور پشاور روانہ ہو گئیں۔ وطن کا خیال، اپنی عدم شرکت کا ملال، قال بے مآل، اس ردیف کا محرک ہوا''۔ پھر اس غزل میں استعمال ہونے والے کچھ الفاظ کی وضاحت بھی کی۔ ''صحرا'' کے ضمن لکھتے ہیں کہ غیر وطن بہن کو کشمیر میں جو نوید روح افزا پہنچی وہ صحرا میں بہار آنے کے مترادف ہے۔ لہٰذا کشمیر سے وطن کی طرف مراجعت بہارِ صحرا درآغوش

تھی۔ پنڈی میں بہن کا کچھ دیر ٹھہرنا میرے لیے بہارِ صحرا اور عازمِ وطن ہونا بہارِ صحرا تا بہ گلشن پھیلنا ہے۔ صحرا سے مراد پنڈی ہے یعنی ہر چند یہ مقام پر فضا ہے لیکن "چو دل ملول بود" (۱۱)

بہار آئی مبارک ہو نوا سنجانِ گلشن کو
نسیمِ صبح کا صحنِ چمن میں گل کتر جانا

.....

اس شعر میں استعمال ہونے والی ترکیب "گل کتر نا" کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں "گل کتر جانا"، فریب دے جانا۔ دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا
موجِ خرامِ یار بھی کیا گل کتر گئی
(غالب)

گل کاٹنا، تراشنا، کترنا، لینا، شمع کا جلا ہوا حصہ قینچی لے کر کتر لینا۔ گل کترنا، کاغذ کے پھول بنانا، انوکھا کام کرنا۔

سونکڑے ہیں ایڑی کے برنگِ گلِ صد برگ
کیا دشت نوردی میں کترتا ہے جنوں گل
(ذوق)

گل کترنا اور شگوفہ چھوڑنا ایک ہی معنی کے دونوں محاورے ہیں، یعنی کوئی ایسی بات کرنا جس سے فساد برپا ہو اور آپ الگ رہے:
دیکھو تو دل فریبیِ اندازِ نقشِ پا (شرح طباطبائی)

.....

گل کترنا، اُس کے نقشِ پا کی دل فریبیوں کے انداز تو دیکھو، موجِ خرامِ یار مقراض بن کر کیسے پھول کتر گئی۔ دوسرے معنی یہ بھی نکلتے ہیں کہ گل کترنا محاورہ ہے جو فساد برپا کرنے کے موقع پر بولا جاتا ہے اور اُس کے نقشِ پا نے زمین پر قائم ہو کر عشاق واغیار میں باہم فساد برپا کر دیا ہے۔ (مرات الغالب۔ بیخود دہلوی)۔ گل کترنا، اندازِ نقشِ پائے یار بھی کتنا دل فریب ہے (موج سے پانی میں نقش و نگار پیدا ہو جاتے ہیں) گویا خرامِ یار ایک موج تھی جس نے یہ گل کترے (صفتِ خوش خرامی)۔ (کلیاتِ اردو غالب۔ شوکت میرٹھی)۔ گل کترنا، کاغذ یا کپڑے وغیرہ کے پھول تراشنا، عجیب کام کرنا (اردو لغتِ فیروزی)"۔ (۱۲)

بعض حاشیوں میں مشاعروں کا احوال بھی درج ہے، ایک اور غزل کے ذیل میں رقم طراز ہیں کہ "۵ فروری ۱۹۴۴ کی شب اردو سبھا کے غیر طرحی مشاعرہ کل ہند کی پہلی نشست تھی۔ عزت مآب نشتر صاحب وزیرِ مواصلات صدر تھے۔ اس کے پیشتر کہ میں کچھ پڑھوں صدر نے میرا تعارف کرایا۔ باہر کے آنے والوں میں شمس العلما تاجور، جگر، روش اور احسان شامل تھے۔ میں نے تین غزلیں پڑھیں، ایک یہ اور دو غزلہ وہ ۲۹ جنوری ۱۹۴۰ء کے تحت میں درج ہے۔ ناسپاسی ہوگی اگر یہ نہ کہوں کہ مشاعرے کی دوسری شب کو برق کوہاٹی (عہد موجود کے نامور شاعر احمد فراز کے والد) نے اپنے استاد علامہ (غالباً علامہ تاجور نجیب آبادی) کے اعزاز میں دعوت دی۔ دعوت کا رسمی شکریہ

بجالانے کے بعد موصوف نے حاضرین کو مخاطب کر کے میرے متعلق وہ کچھ کہا جس کا میں اہل نہیں"۔(۱۳)

بعض اشعار کی وجہِ تخلیق بھی اپنی بیاض میں درج کرتے رہے۔ مثلاً

کس سے اب جا کر ملیں کرنال میں
ملنے والے سب خدا سے جا ملے

.....

اس شعر کی حامل غزل پر ۲۹ اکتوبر ۱۹۴۳ء کی تاریخ درج ہے۔ قضا روحی اس شعر سے متعلق رقم طراز ہیں کہ "عہدِ عتیق کی یاد میں بابو رام لعل کو میں نے خط لکھا۔ ان کے بیٹے کا جواب آیا کہ وہ مدت ہوئی فوت ہو چکے ہیں اور جن ملنے والوں کا پوچھا ہے، ان میں بھی کوئی زندہ نہیں۔ میں اس خیال میں کہ، یار زندہ صحبت باقی، لیکن جب یہ معلوم ہوا کہ "مرے سب آشناؤں نے قضا کی تو میں نے متاسف ہو کر کہا:

کس سے اب جا کر ملیں کرنال میں
ملنے والے سب خدا سے جا ملے

.....

پھر بعض کی اس معدومیت پر اور بھی افسوس ہوا کہ ان کی قبر بھی نہیں"۔(۱۴)

ایک غزل کے مطلع میں انہوں نے ایک استاد کے مصرع پر گرہ لگائی

"ہم ہیں اب اور گردشِ ایام ہے"
کیا ہماری صبح ہے کیا شام ہے

اس شعر کے بارے میں لکھا ہے کہ "ورق سیاہ کر چکا تھا کہ اسی زمین میں ایک استاد کا یہ مصرع دیکھا: "ہم ہیں اب اور گردشِ ایام ہے"۔ غالب، تفتہ کو اس کے ایک قصیدے کی داد دیتے ہوئے لکھتے ہیں "کہ ایک مصرع میں تم کو محمد اسحاق شوکت بخاری سے توارد ہوا، یہ بھی محلِ فخر و شرف ہے کہ جہاں شوکت پہنچا وہاں تم پہنچے"۔ میں کہتا ہوں کہ توارد سمجھنے والے تو جنت کو سدھارے آج توارد، تضمین ہی کہلائے تو بڑی بات ہے"۔(۱۵)

قضا روحی صاحب کو تاریخ کہنے میں بھی ملکہ حاصل تھا۔ کئی عزیزوں اور دوستوں کی تاریخ ہائے وفات کہیں جو بیاض کی زینت ہیں ان کی خوبی یہ تھی کہ جس کی تاریخ کہی حاشیہ میں یا تاریخ کہنے سے قبل اس کی وضاحت بھی کر دی کہ یہ کون صاحب ہیں یا ان کی تاریخ لکھنے کا سبب کیا ہے۔ معروف شاعر سکندر شاہ رعنا کی تاریخ وفات لکھی تو اس کے حاشیہ میں ان کے بارے میں چنیدہ معلومات بھی فراہم کر دیں۔ لکھتے ہیں "ہجرت کے سیلاب میں ۲۰-۱۹۱۹ء کو غیر علاقے سے ہوتے ہوئے ایران پہنچے۔ کچھ عرصہ قیام رہا، دوران قیام سینا کو اپنا کلام دکھاتے، سینا کا دیوان میں نے دیکھا، بہت سادہ لکھتے تھے۔ اخذ و نقل کا مادہ خوب تھا۔ خوبی یہ کہ تکلف کا شائبہ تک نہیں۔ اسی لیے جب کچھ پڑھتے تو اہلِ زبان منہ تکتے، زبان صاف، بیان شستہ، بندش استادانہ، عام گفتگو میں بھی عامیانہ الفاظ سے گریز

کرتے۔ شعر تر کہتے اور جلد کہتے۔ مزاج میں خشکی تھی مگر اس خشکی کا اثر متقابلین تک تھا، اور وہ اس سے اور بھی چمکتے۔ ایران کی کسی بزم ادب کی طرف سے افصح المتکلمین کا خطاب ملا تھا۔ خطاب سے لفظاً کسی کو انکار ہو لیکن معناً انکار ظلم ہے۔ ڈاکٹر اقبال نے اردو میں اور مولانا اصغر علی روحی اور شمس الہند نے فارسی میں نہایت فراخ دلی سے ان کی قابلیت کا اعتراف کیا ہے"۔(۱۶)

قضا روحی نے جیسا کہ خود تسلیم کیا ہے وہ داغ سے اصلاح لیتے رہے ہیں اور داغ کے ساتھ غالب سے بھی استفادہ کرتے رہے، ان کی شاعری کے مطالعہ سے یہ بات درست معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے مضامین میں تو رنگِ داغ کا تتبع کیا لیکن زبان انہیں غالب کی مرغوب رہی۔ انہوں نے اردو میں صرف غزل کو ترجیح دی ہے تاہم ان کے ہاں ایک آدھ مثنوی بھی نظر پڑی ہے۔ فارسی کلام میں بھی البتہ نظم کی ہیت کو اپنایا گیا ہے۔

قضا روحی نے صاف ستھری زبان میں اپنے خیالات قاری تک پہنچائے ہیں۔ ان کے ہاں عشق ہوس پرستی کا شکار نہیں ہوا بلکہ ایک توازن اور وقار کے ساتھ شعر کا حصہ بنا ہے۔ تصوف سے بھی چونکہ انہیں رغبت رہی، اس لیے صوفیانہ مضامین بھی ان کے ہاں موجود ہیں۔ کلاسیکی غزل کے قریباً تمام نمایاں اوصاف قضا روحی کی شاعری کا خاصہ رہے ہیں۔ وہ رمز و اشاریت کے دلدادہ تھے، قافیہ و ردیف کی پابندی کرتے، طویل غزل لکھتے، کوئی قافیہ رہنے نہ دیتے تھے۔ ان کے ہاں حیات و ممات، عشق و محبت، تصوف، فلسفہ، غمِ محبوب، ناز و انداز، ساقی، جام و سبو، گل و بلبل، گلستان، صبا، باغباں و گل چیں، وصل و ہجر، نزاکت و لطافت کا رنگ وہی ہے جو ہماری غزل کا خاصا رہا ہے:

چشمِ وا ساقی کی بزم ناز میں بیگانہ تھی
دل خریدار متاعِ گردشِ پیمانہ تھا

.....

پریشاں کر دیا میری پریشانی نے اُن کو بھی
ادائے حرفِ مطلب میں اِدھر جانا اُدھر جانا

.....

ہر قدم پر ہیں یہاں جام و سبو
آپ ٹھوکر نہ کہیں کھائیے گا

.....

گھر سے وہ نکل آئے ہو کے شور سے برہم
آہ بے اثر دیکھی نالے کو رسا پایا

.....

ہم نے ان کو کبھی دیکھا ہی نہیں
اور اس پر ہیں پرستار، یہ کیا

.....

میں یہ کہتا ہوں مجھے جو کچھ دیا غم نے دیا
وہ یہ کہتے ہیں کہ غم کس نے دیا، ہم نے دیا

.....

سنا ہے یہ دل آپ کا گھر ہے لیکن
کبھی آپ کو جلوہ فرما نہ دیکھا

.....

بٹ رہا ہے دوستوں میں جو تبرک کی طرح
میرا داماں ہی تو ہے میرا گریباں ہی تو ہے

.....

نکھیوں سے مجھے وہ دیکھتے ہیں بزمِ خوباں میں
کوئی پوچھے تو یہ ان سے کہ مجھ سے بدگماں کیوں ہو

.....

اب غیر تو کوئی نظر آتا نہیں مجھ کو
ہیں آئنۂ دل میں اِدھر آپ اُدھر آپ

.....

میں خریدار نہیں ہوں اس کا
جو ستم آپ کی ایجاد نہ ہو

.....

آئی سمجھو گھڑی قیامت کی
زلف سے ماپتے ہیں قد اپنا

.....

قضا روحی کا کلام گزشتہ کئی دہائیوں سے اشاعت کا منتظر تھا تاہم ان کے نواسے قاضی ہمایوں صاحب اور محترم مظہرالاسلام صاحب کے توسط سے یہ کلام ''کلیاتِ قضا'' کے نام سے 2017ء میں شائع ہوا ہے۔ مظہرالاسلام صاحب کے توسط سے مجھے قضا روحی صاحب کی بیاض دیکھنے اور اس بارے کچھ لکھنے کا موقع ملا تو مجھے خوشی ہوئی کہ انہوں نے ایک اچھے شاعر کے کلام کو محفوظ کرنے کے نیک کام میں مجھے بھی شریک کیا۔

میں نے قضا روحی کی جو بیاضیں دیکھی ہیں اور جنھیں کلیات کی صورت دی ہے، اُن میں کئی جگہ پر اشعار پڑھے نہیں جا سکے۔ کاغذ بوسیدہ ہونے کے سبب بہت سے حاشیے بھی نہیں پڑھے گئے لیکن جس قدر ممکن ہوا میں نے قضا صاحب کا کلام کمپوز کرایا اور پھر اسے کلیات کی شکل دے کر مظہرالاسلام صاحب کے حوالے کر دیا۔ کلیات کی ترتیب و تدوین کی ذمہ داری میرے سپرد تھی، سو میں نے اسے ہر ممکن کوشش سے پورا کیا، قضا صاحب کے حالاتِ زندگی اور شعری سفر کی بازیافت کے ضمن صرف ان کی بیاضیں ہی کام آسکیں۔ یہ معروضات بھی حرفِ اول کے طور سامنے لائی جا رہی ہیں تاکہ ان کی زندگی اور فن پر مزید بات ہو سکے۔ قضا کی چند منتخب غزلیں ملاحظہ ہوں:

پھر وہی کوچہ و در یاد آیا
پھر وہی ذوقِ نظر یاد آیا
یاد آیا وہ شجر یاد آیا
اشک اسی کا ہے ثمر یاد آیا
جب کسی آنکھ کو روتے دیکھا
ہم کو جنت کا شجر یاد آیا
اس نے دو چار سنا دیں مجھ کو
وہ بھی قسمت سے اگر یاد آیا
مرتے دم لب پہ ہے اللہ اللہ
زادِ رہ وقتِ سفر یاد آیا
چھیڑتا ہوں ترے پھر دل کو
یعنی اک رقصِ شرر یاد آیا
جب کہیں کوئی بگولہ اٹھا
ہم کو اک خاک بسر یاد آیا

میں چلا، تھامنا، لینا مجھ کو
پھر وہی کوچہ و در یاد آیا
کعبہ و دیر میں ڈھونڈا دل کو
وہ اُدھر ہے نہ اِدھر یاد آیا
لب سے لب ہو ہی گئے ہیں پیوست
جب مجھے صبر کا گھر یاد آیا
یاد کر یاد ہے یہ بھی کوئی
جب پڑی مجھ پہ نظر یاد آیا
کیا مرے ٹوٹ گئے ہیں بازو
کیوں مجھے بالشِ پَر یاد آیا
عکس کس کا ہے یہ آئینے میں
ہے وہی آئینہ گر یاد آیا
زیر و بم بھول گئے پیشِ قضا
پھر نہ کچھ زیر و زبر یاد آیا

....

شرح کو شکایت کی ہم نے غم رسا پایا
درد کا بیاں ہونا درد کی دوا پایا
خون ہو گئے دل کی جستجو سے کیا پایا
یہ کہ تیرے پیکاں سے ہم نے دوسرا پایا
گھر سے وہ نکل آئے ہو کے شور سے برہم
آہ بے اثر دیکھی، نالے کو رسا پایا
جنبشِ صبا پنہاں رازِ خندۂ گل تھا
صبح صحنِ گلشن میں غنچے کو کھلا پایا
شمع اور پروانہ شیشہ اور پیمانہ
دل اِدھر جلا دیکھا خون اُدھر بہا پایا
گو کہ پھر نہ اٹھنے پر ناز ہے بجا اس کو
فرشِ خاک پر جس نے تیرا نقشِ پا پایا
خشک استخواں خوراک، خواب ہیں خس و خاشاک
تو نے اس سعادت سے سود کیا ہما پایا
حالِ قسمتِ ناساز پوچھئے سکندر سے
کیا ملا اگر اس نے خضر رہنما پایا
ترکِ ماسوا سے ہم کیا کہیں کہ کیا پایا
ایک ماسوا کیا ہے اس سے ماسوا پایا
زخمِ غیر دل بھی گو زخم ہے مگر ہم نے
ایک زخمِ دل ہی کو زخمِ دل کشا پایا
ہو گئی غلط اس کی شانِ بے نیازی سے
تھی مثل جو دنیا میں جس نے جو کیا پایا
لذتِ شہادت کاش لوٹنے نہ دے ہم کو
غیر کو نہ ہو معلوم ہم نے کیا مزہ پایا
وعدے کی وفا معلوم حالِ زارِ دل مفہوم
وقت کا تقاضا ہے ہم نے مدعا پایا
تیری آشنائی سے ناک میں ہے دم میرا
جس پہ کی نظر میں نے اس کو آشنا پایا
سدِّ راہ تھا دل ہی اس میں بھی قضا اپنا
دل کے کھوئے جانے سے ہم نے مدعا پایا

....

ان آنکھوں نے دنیا میں کیا کیا نہ دیکھا
مگر تجھ کو دیکھا نہ دیکھا نہ دیکھا
نہ دیکھا وہ تیرا ہی جلوہ نہ دیکھا
برابر ہے آنکھوں کا دیکھا نہ دیکھا
مظاہر سے ہم نے معرا نہ دیکھا
نہ دیکھا کہیں تجھ کو تنہا نہ دیکھا
دل اپنا شدائد سے دبتا نہ دیکھا
یہ پھوڑا ہے وہ جس نے نیچا نہ دیکھا
نہیں یہ کہ پردہ ہے آنکھوں پہ میری
ترے رخ سے پردہ نہ اٹھا نہ دیکھا
ترے حلم سے ہے ترا قہر افزوں
جب آیا تو اپنا پرایا نہ دیکھا

وہ نفسانیت کا وہ شہوانیت کا
کوئی ہم نے بندہ خدا کا نہ دیکھا
وہ دل کیا تری جس میں پرواہ نہ دیکھی
وہ سر کیا ترا جس میں سودا نہ دیکھا
زمانے میں سب کام فرما ہی دیکھے
نہ دیکھا کوئی کار فرما نہ دیکھا
بھٹکتا ہوں میں اس طرح چار سو میں
کہیں پختہ ملنے کا رستہ نہ دیکھا
نہ ملنے کی تجھ کو شکایت ہے لیکن
ملوں کیا کہ ملنے کا رستہ نہ دیکھا
یہ دنیا وہ منحوس گھر ہے کہ جس میں
کوئی چار دن بھی تو بستا نہ دیکھا
سنا ہے یہ دل آپ کا گھر ہے لیکن
کبھی آپ کو جلوہ فرما نہ دیکھا
مژہ ہی کا دامن پکڑنا تھا آخر
جب اشکوں نے کوئی سہارا نہ دیکھا
کروں عرضِ مطلب میں کیا لب کشائی
کہ بے حکم پتا بھی ہلتا نہ دیکھا
کہاں لے کے جائے قضا اپنے دل کو
یہ پھول اس چمن میں تو کھلتا نہ دیکھا

.....

آنکھوں سے گو نہاں تھا وہ، دل سے نہاں نہ تھا
ہر دل میں تھا نشاں کوئی دل بے نشاں نہ تھا
اللہ رے اعتقاد کہ جب تک عیاں نہ تھا
باطن کو فیضِ صحبتِ پیرِ مغاں نہ تھا
وہ کون سی زمیں تھی جہاں آسماں نہ تھا
البتہ ایک شہرِ خموشاں، جہاں نہ تھا
افسوس زندگی میں یہ ہم پر عیاں نہ تھا
مر کر کھلا کہ زیرِ زمیں آسماں نہ تھا
خلوت میں بھی وہ مجھ سے کبھی بدگماں نہ تھا
یہ اعتبار و حوصلہ بے امتحاں نہ تھا
یہ تو نہیں کہ کھو گیا دل اس کو دیکھ کر
اتنا ضرور ہے کہ جہاں تھا وہاں نہ تھا
آخر یہ دل اسی کو بنایا ہوا تو ہے
کیوں کر کہوں کہ رازِ دل اس پر عیاں نہ تھا
جوشِ جنونِ عشق میں کی لامکاں کی سیر
اب کیا کہوں وہ کیا تھا جہاں کیا جہاں نہ تھا
چھوٹا قفس سے میں تو ہوا آشیاں کا فکر
جب تک قفس میں تھا تو غمِ آشیاں نہ تھا
دل ان کو دے کے میں نے کیا قصہ مختصر
اب اس میں فائدہ کہ چنیں تھا چناں نہ تھا
تھا لطف گر زبان بھی ہوتی دہن کے ساتھ
ہر غنچہ بے دہن تھا مگر بے زباں نہ تھا
حسنِ نظر کی ہے یہ قضا قدر مشترک
خلوت میں بھی وہ مجھ سے کبھی بدگماں نہ تھا

.....

جلوۂ ساقی، حجاب روئے دنیا ہو گیا
بادبانِ کشتیِ مے، بالِ عنقا ہو گیا
خواب تھا جب عشق اس کا کارِ دنیا ہو گیا
ماہ کنعاں شمعِ ایوانِ زلیخا ہو گیا
فرطِ غم میں گریہ سے دل کچھ تو ہلکا ہو گیا
میری مژگاں مجھ کو تنکے کا سہارا ہو گیا
لکھ کے عرضِ شوق میں خط ان کو رسوا ہو گیا
وہ مرا لکھا میری قسمت کا لکھا ہو گیا
دیکھتے ہی دیکھتے اک حشر برپا ہو گیا
ہائے رے اللہ ابھی کیا تھا ابھی کیا ہو گیا
دیکھ کر آئینہ وہ محوِ تماشا ہو گیا
لیجئے اب حضرت دل ختم قصہ ہو گیا

دل کھلونا تو نہ تھا ان کا کھلونا ہو گیا
آنکھ پھیری مر گیا دیکھا جو زندہ ہو گیا
عقدۂ مشکل ہوا ہے اضطراب دل سے حل
ٹوٹ کر، الجھا ہوا تارِ نفس وا ہو گیا
آمد و رفتِ نفس تھی نو بہارِ زندگی
بند وہ جب ہو گئی ہے ختم میلا ہو گیا
پھیرتے تھے ہاتھ وہ دل پر تسلی کے لیے
یہ مری قسمت کہ دل سینے کا پھوڑا ہو گیا
کہہ دیا تھا آج ان سے درد دل کچھ سوچ کر
چاہتے تھے ہم ازالہ اور اضافہ ہو گیا
عشق بھی کیا نام اسی کا ہے جو پروانے کو ہے
شمع جو بھی آئی محفل میں اسی کا ہو گیا
کھل کے بیٹھیں کھل کے بولیں اب نہ آنکھیں ہیں نہ کان
اہلِ پردہ سے ہمارا آپ پردہ ہو گیا

.....

مری تقدیر میں ہیں ناخنِ تدبیر کے ٹکڑے
کہ میری سخت جانی سے ہوئے شمشیر کے ٹکڑے
وہ سنتے خندہ پیشانی سے عرضِ مدعا دل کا
ہوئے جاتے ہیں برہم دیکھ کر تقریر کے ٹکڑے
ہمارے پیکرِ بے جاں ہی پر آنا تھا غصہ بھی
اڑائے کیا سمجھ کر آپ نے تصویر کے ٹکڑے
سنایا کیوں انہیں سن کر چباتے ہیں وہ ہونٹ اپنے
ہوئے جاتے ہیں میرے خواب کی تعبیر کے ٹکڑے
بھنویں تنتی ہیں، خنجر ہاتھ میں ہے، تن کے بیٹھے ہیں
کہاں تک ہیں مری قسمت میں یہ تحقیر کے ٹکڑے
نہیں اہلِ نظر شیخ و برہمن کی کشاکش میں
انہیں دونوں ہیں کاف و نون کی تفسیر کے ٹکڑے

کبھی دستِ ہوس سے دامنِ دنیا نہ چھوٹے گا
تقاضا جب تک نہ ہوں گے دستِ دامنگیر کے ٹکڑے

.....

ہمارے غنچۂ دل کو صبا کھولے تو ہم جانیں
تمہیں کھولو تو کھولو، دوسرا کھولے تو ہم جانیں
یہ سن کر منہ کوئی کافر ادا کھولے تو ہم جانیں
وہ بولے کیا کہا یہ کون کیا کھولے تو ہم جانیں؟
دہن اپنا رقیبِ بے حیا کھولے تو تم جانو
زباں اپنی دلِ صبر آشنا کھولے تو ہم جانیں
گریباں پھاڑنے کی مشق تو دستِ جنوں کو ہے
کبھی اس شوخ کے بندِ قبا کھولے تو ہم جانیں
کسی صورت ہمارا دل نہیں کھلتا، نہیں کھلتا
کہاں ہے، ہے کوئی مردِ خدا کھولے تو ہم جانیں
ہمارے دل کو تم اب آزما لو جس طرح چاہو
جفا کھولے تو ہم جانیں وفا کھولے تو ہم جانیں
سفینے کو ہمارے ناخدا سے واسطہ کیا ہے
خدا کھولے نہ کھولے ناخدا کھولے تو ہم جانیں
تقاضا احیاءِ گل آسان ہے احیاءِ دل مشکل
مسیحا بھی لبِ معجز نما کھولے تو ہم جانیں

.....

غنچۂ عزلت نشیں پردہ سرائے خندہ ہے
بہرِ خوباں گریۂ عاشق بنائے خندہ ہے
گل کو شبنم باعثِ نشوونمائے خندہ ہے
عشق میں فکرِ تن آسانی بنائے خندہ ہے
بخیۂ چاکِ جگر دنداں نمائے خندہ ہے
پوچھ مت نیرنگیٔ دل سوزی ابنائے دہر
لب، کنارِ گریہ و چشمِ آشنائے خندہ ہے
دامنِ تیغِ عدو ہے دستِ فرسود نظر
کس قدر زخمِ جگر کو التجائے خندہ ہے

از پئے وا رفتگانِ کیفِ صہبائے الم
حلقۂ مینائے، داغِ عشق ہائے خندہ ہے
ابرِ رحمت! تابکے یہ دامن افشانی تری
شاخِ گل ہائے چمن، دستِ گدائے خندہ ہے
میکدہ، بزمِ نشاط آہنگِ رنداں ہے قضا
قلقلِ مینا نوا سنجِ صلائے خندہ ہے

.....

بہرِ اظہاراتِ وجدانی دہن میں کچھ نہ تھا
دل میں کیا کیا کچھ نہ تھا لیکن سخن میں کچھ نہ تھا
داد، داد، آخر بداد، اوجِ دلِ بیداد داد
داد از دادِ سخن دادِ سخن میں کچھ نہ تھا
بے زبانی تھی زبانِ نقطہ ہائے بے زباں
ہستیِ سرشارِ مرغانِ چمن میں کچھ نہ تھا
چشم تھی ہر چند اک دامِ طلسمِ رنگ رنگ
دل جو اپنا خوش نہ تھا گویا چمن میں کچھ نہ تھا
جلوۂ اوراقِ گل آئینۂ لبریزِ حسن
جز کفِ حسرت مژہ برہم زدن میں کچھ نہ تھا
پوچھ مجھ سے حاصلِ سعیِ تسیمِ فصلِ گل
یعنی اس لختِ جگر اندوختن میں کچھ نہ تھا
باوجودِ انفعالاتِ تقاضائے بیاں
کاو کاوِ ناخنِ زخمِ کہن میں کچھ نہ تھا
بے نتیجہ ہر پیامی سن چکا ہے قال و قول
مختصر یہ ہے کہ قولِ ممتحن میں کچھ نہ تھا
سر کو اپنے اب وہ سودائے من و مائی نہیں
کھل گیا آخر کہ بحثِ ماؤ من میں کچھ نہ تھا
تھی نمائش گاہِ باغِ سبز ہر یک چشمِ سبز
سبز چشمانِ بتانِ سیم تن میں کچھ نہ تھا
آ گئے دھوکا میں ہم بھی رختِ ہستی دیکھ کر
خوش نما معلوم ہوتا تھا چلن میں کچھ نہ تھا
اک بگولہ بھی نہ اٹھا لے کے مٹھی خاک کی
میری وحشت کے لیے افسوس بن میں کچھ نہ تھا
دیکھتا ہوں وصل میں جب اس کی مٹھی کھول کر
جز شکن، زلفِ شکن، اندر شکن میں کچھ نہ تھا
ہے قضا پھر بھی مجھے دل سے عزیز اپنا وطن
گو خلوصِ دل عزیزانِ وطن میں کچھ نہ تھا

حوالہ جات

۱۔ قلمی بیاض، ملکیت قاضی ہمایوں، سابق سفیر، سیکرٹری یوتھ ہاسٹل اسلام آباد
۲۔ ایضاً
۳۔ ایضاً
۴۔ ایضاً
۵۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷
۶۔ قلمی بیاض، ملکیت قاضی ہمایوں، سابق سفیر، سیکرٹری یوتھ ہاسٹل اسلام آباد
۷۔ روزنامہ جنگ راولپنڈی ۲۸ ستمبر ۱۹۸۷
۸۔ قلمی بیاض، ملکیت قاضی ہمایوں، سابق سفیر، سیکرٹری یوتھ ہاسٹل اسلام آباد
۹۔ ایضاً
۱۰۔ ایضاً
۱۱۔ ایضاً
۱۲۔ ایضاً
۱۳۔ ایضاً
۱۴۔ ایضاً
۱۵۔ ایضاً
۱۶۔ ایضاً

☆☆☆☆☆

''شعری دانش کی دُھن میں''

جلیل عالی اس وقت وطن عزیز کے سینئر شعراء میں نمایاں مقام کے حامل ہیں۔ غزل اور نظم دونوں پر بڑی دستگاہ رکھتے ہیں۔ غزل میں ان کا پایہ بہت بلند ہے۔ حمد و نعت میں بھی انہوں نے اپنے شعری تجربات کو ایک نئے انداز سے پیش کیا ہے۔ ان کی شاعری میں ہماری مذہبی، تہذیبی، لسانی اور معاشرتی اقدار کے مضامین جابجا دیکھنے میں آتے ہیں۔ ان کی شاعری کی جڑوں میں قومی وجود کا احساس جگہ جگہ دھڑکتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔

جلیل عالی عمدہ نثر بھی لکھتے ہیں، انہوں نے زبان میں نئے رجحانات بھی متعارف کروائے ہیں۔ تنقید بھی ان کا خاص میدان ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے انہوں نے کئی ادبی جریدوں میں نہایت فکر انگیز مضامین تحریر کیے ہیں، جنہیں ادبی حلقوں میں بے حد سراہا گیا ہے، وہ فلسفے میں گہری دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان کی تحریریں اعتدال سے مملو ہیں۔ انہوں نے ہمیشہ اپنے مضامین میں قدیم معاشرتی روایات کو پیشِ نظر رکھتے ہوئے جدید ادبی اور علمی رجحانات پر نہایت متوازن بحث کی ہے۔ پچھلے کئی برسوں سے ہماری ادبی تنقید جمود کا شکار ہے، اور اس پر مختلف حلقوں کی طرف سے اعتراضات بھی اُٹھائے جاتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ذاتی پسند و ناپسند کی وجہ سے ادب میں تنقید کے معیار کو کافی نقصان بھی پہنچا ہے۔ لیکن وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر چیز تبدیلیوں کی زد میں آتی ہے۔ اگر کہیں پرانی اقدار منہدم ہوتی ہیں تو ان کی تعمیر اور ان میں بہتری لانے کے لیے قدرت نئے راستے کھول دیتی ہے۔ ہماری جدید اردو شاعری کو آگے بڑھانے کے لیے بہت اداروں نے کام کیا ہے اور جن شاعروں نے اپنی خوبصورت اور جاندار شاعری کے ذریعے اردو ادب کو استحکام بخشا، جلیل عالی نہ صرف ان کے فن کی اہمیت سے باخبر رہے ہیں بلکہ انہوں نے ان کی شاعری کی گہرائی میں جا کر ان کی شعری بصیرت اور اہمیت کو اپنے مضامین کے اندر سمو کر انہیں ادبی تاریخ میں زندہ و جاوید کر دیا ہے۔ شاعر دنیا میں آتے ہیں اور چلے جاتے ہیں، لیکن ان کا فن زندہ رہتا ہے۔ لیکن ایک دیانت دار اور

ہارون الرشید

باصلاحیت نقاد محنت اور مشقت سے لکھے ہوئے مضامین کے ذریعے ان کی شاعری کو ان لوگوں کے سینے میں بھی اُتار دیتا ہے جن کا ادبی اور علمی فہم زیادہ نہیں ہوتا۔

جلیل عالی کے تنقیدی اور تحقیقی مضامین کا مجموعہ ''شعری دانش کی دُھن میں'' ایک وسیع اور دقیع علمی دستاویز ہے۔ جس میں عصر حاضر کے اہم شعراء کے فن کی وسعت کو اتنی عمدگی سے اجاگر کیا گیا ہے کہ ایک قاری کی ان سے محبت اور بڑھ جاتی ہے۔ انہوں نے اپنے ان مضامین میں میرٹ کو سامنے رکھ کر ان شعراء کو موضوع کیا ہے جو واقعی داد و تحسین کے مستحق ہیں۔ پچیس مضامین پر مشتمل یہ کتاب علم و ادب کے سنجیدہ قاری پر نئے امکانات کے در کھولتی ہے۔ جلیل عالی نے ''پاکستانی کلچر کیا؟ اور کیسے؟'' اور ''پاکستانی ثقافت (اتفاق واختلاف)'' میں جس دردمندی اور خلوص سے پاکستانی کلچر اور ثقافت پر بحث کی ہے اور بعض سوال اٹھائے ہیں وہ واقعی قابلِ غور ہیں۔ جلیل عالی ایک متوازن اسلامی تہذیبی سوچ رکھتے ہیں، اور وہ اسے ہر جگہ ساتھ لے کر چلتے ہیں اور یہ انتہائی ضروری بھی ہے۔ وہ اس بات پر شدت سے یقین رکھتے ہیں کہ پاکستان کا قیام محض ہندوؤں کی تہذیب اور کلچر کے سبب عمل میں نہیں آیا، بلکہ اس کے پیچھے فکرِ اقبال کا وہ اسلامی دھارا ہے جس نے مسلمانوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ ان کی مسلمانی سب سے اہم ہے اور اسی تصور پاکستان کو وہ حقیقی سمجھتے ہیں۔ جلیل عالی ان نام نہاد دانشوروں کو خاطر میں نہیں لاتے جو پاکستان میں رہ کر اس کے خلاف باتیں کرتے ہیں۔ وہ قائد اعظم محمد علی جناح اور علامہ اقبال کے عاشق زار ہیں اور جو ان دونوں سے عشق کرتا ہے وہ اسلام اور پاکستان سے یقیناً ٹوٹ کر محبت کرتا ہے۔ وہ وطنِ عزیز میں دین کے ارتکاز کو کس نظر سے دیکھتے ہیں۔ ''پاکستانی کلچر کیا؟ اور کیسے؟'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں۔

> ''اگرچہ پاکستانیوں کی اکثریت کے اجتماعی باطن میں اسلام کی انقلابی رُوح کو قومی زندگی کے جملہ شعبوں میں علمی طور پر کارفرما دیکھنے کی تمنا موجود ہے اور یہ پاکستانی ثقافت کے باطنی پہلو کی نمایاں خصوصیت بھی ہے۔ تاہم اس سے پاکستانی ثقافت کی شناخت میں پاکستان کے ہر گوشے میں بسنے والے پاکستانیوں کے ٹھوس مشترک ثقافتی عناصر کی اہمیت کم نہیں ہوتی۔ البتہ ایک نظریاتی قوم ہونے کے دعوے کے حوالے سے نصب العینی

کا تقاضا یہ ہوگا کہ ہم ظلم و ناانصافی اور جبر و استحصال کے خاتمے کی انقلابی رُوح کے مطابق پاکستانی ثقافت کو مسلسل نکھارنے کی تگ و دو جاری رکھیں اور پاکستانی قوم کو عالمگیر وفاداری کی عظیم روایات کی امین بنا دینے کی منزل کی طرف سرگرم رہیں۔"

"وطن عزیز کی فکری و تہذیبی روداد و فریاد" تو گویا ریاست کا نوحہ ہے۔ طویل فوجی آمریتوں کے نتیجے میں ملک کی جمہوریت، تہذیب، زبان اور اقدار جس طرح سے برباد ہوئیں، انہوں نے نہایت عرق ریزی سے ان وجوہات کا اپنے تئیں محاکمہ کیا ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ ریاست کی آزادی، بقا و سلامتی اور ترقی کا خواب کیسے پورا کیا جا سکتا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ پاکستان ایک عظیم نعمتِ خداوندی ہے، اس لیے ہماری سیاسی، سماجی اور فکری اشرافیہ کو اپنے تہذیبی بہاؤ سے باہر نہیں جانا چاہیے۔ بلکہ قائداعظم اور علامہ اقبال کے وضع کیے ہوئے اصولوں کے مطابق کاروبار مملکت چلانا چاہیے اور یہی اصول ملک کو خوشحال اور متحد کر سکتے ہیں۔ "تخلیق و تنقید اور ہمارے فکری رویے" ان کا ایک اہم اور قابل غور مضمون ہے جس میں انہوں نے ترقی پسند تحریک اور حلقہ ارباب ذوق کے کردار پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اور ان کی کاوشوں اور بعد ان کے ادب پر پڑنے والے اثرات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ان دونوں نے اپنے پیچھے جو اثرات چھوڑے ہیں، وہ آج بھی اپنے ہونے کا بھرپور احساس دلاتے ہیں۔

انہوں نے سرسید احمد خان، مولانا الطاف حسین حالی اور مولانا محمد حسین آزاد کی ادبی اور تعلیمی کاوشوں کا نہایت فراخدلی سے اعتراف کیا ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ ان بزرگوں کی سنجیدہ اور مخلصانہ جدوجہد نے بعد میں آنے والی نسلوں پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ علامہ اقبال نے بھی ان کی خدمات سے صرف نظر نہیں کیا۔ میں سمجھتا ہوں کہ ہماری ادبی تخلیقات میں ہماری فکری تہذیب انہی محسنوں کے دم سے زندہ و سلامت ہے۔

غزل ہماری اردو شاعری کے ماتھے کا جھومر ہے۔ یہ ایک ایسی بے مثال اور سخت جان صنف ہے جو اپنے آغاز سے لے کر آج تک نہ صرف زندہ و تابندہ ہے بلکہ اس کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ پہلے کلیم الدین احمد اور اب ستیہ پال آنند جیسے بزرگوں کی مخالفت کے باوجود اس نے ہر عہد میں اپنی شناخت اور وجود کو نہ صرف منوایا ہے بلکہ اس

کی وسعت اور ہمہ گیریت میں اضافہ کیا ہے۔ ہماری ''تہذیبی روایت اور اردو غزل''، ''غزل کے کلاسیکی استعارے''، ''درجواب آنند''، ''نیا ادب اور اردو غزل'' اور ''معاصر اردو غزل'' میں انہوں نے اردو غزل کا جو مقدمہ جدید رجحانات کو سامنے رکھتے ہوئے لڑا ہے اور نہایت مدلل انداز میں ان کو جواب دیا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو صنف زیادہ مقبول اور محبوب ہوتی ہے، اس کے مخالفین اور حاسدین بھی کم نہیں ہوتے۔ جلیل عالی کا یہ کہنا درست ہے کہ:

''غزل اپنے ارفع تخلیقی درجے پر محدود سے لامحدود، معلوم سے نامعلوم اور طبیعاتی دنیا سے مابعد الطبیعاتی جہان کا فکری و احساساتی سفرنامہ ترتیب دیتی ہے۔''

انہوں نے اپنے ان مضامین میں غزل کی اہمیت اور اس کی تاریخ کو جس عمدگی سے سمو دیا ہے اس پر یقیناً وہ داد کے مستحق ہیں۔

''تنقیدی تھیوری اور تفہیم غالب'' غالب کی شاعری کی عظمت کا عکاس ہے۔ جلیل عالی نے اس مضمون میں غالب کی فنی ہمہ گیریت کے کچھ گوشے وا کیے ہیں، ان کا یہ کہنا صحیح ہے کہ فکری و تہذیبی روایت کے تصور حقیقت، تصور کائنات، تصور خیر و شر اور تصور انسان کو سمجھے بغیر غالب کے کلام کی پرتوں کا کھلنا محال ہے۔ غالب محض ایک شاعر اور فلسفی ہی نہیں، بلکہ نہایت وسیع النظر دانشور بھی تھے۔ برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور اقتدار پر قبضے کے بعد ہندوستان کا پورا منظر بالکل بدل گیا، اور آنے والے وقتوں میں جو کچھ منظر عام پر آنے والا تھا غالب اس کی جھلکیاں دیکھ چکے تھے۔ انہیں اس بات کی حسرت تھی کہ ہندوستان بھی اسی طرح تعلیمی اور سائنسی میدان میں ترقی کرے جس طرح یورپ نے کی تھی۔ جلیل عالی نے بھی اس مضمون میں ان جزوں کی نشاندہی کی ہے۔

''آب و باد و خاک کا نغمہ خواں'' جدید آزاد نظم کے شاعر ن۔ م راشد کے متعلق جلیل عالی کے گہرے مطالعے اور مشاہدے کی عکاسی کرتا ہے۔ ن۔ م راشد آزاد نظم کے بانیوں میں شمار کیے جاتے ہیں۔ ان کی نظمیں محض نظمیں ہی نہیں بلکہ معاشیات و عمرانیات، تاریخ و تہذیب، انسانی مسائل اور عالمی المیوں کا احاطہ کرتی ہیں۔ فیض احمد فیض بھی ان کی نظموں کی فنی بلندی کے معترف تھے، بلکہ ان کا کہنا تھا کہ ن۔ م راشد کا ذہنی کینوس ہم سے بہت وسیع ہے۔ ان کا المیہ یہ ہے کہ ان کی زندگی کا طویل عرصہ دیار غیر میں بسر ہوا اور وہیں ان کا انتقال ہوا۔ اس لیے ان کی شخصیت کے بارے میں پاکستان میں زیادہ تحریریں منظر

عام پر نہیں آئیں۔ لیکن ان کی شاعری اردو ادب میں بڑا مقام رکھتی ہے۔ لیکن اس پر تنقیدی اور تحقیقی کام بہت کم ہوا ہے۔

فیض احمد فیض عصر حاضر کے بہت بڑے شاعر ہیں۔ علامہ اقبال کے بعد ان کا مقام یقیناً وہاں ہے جہاں اسے ہونا چاہیے۔ یہ ایک عجیب اتفاق ہے کہ عموماً شاعر اور ادیب ایک دوسرے کو پسند نہیں کرتے۔ قارئین ادب، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے طلباء کے اپنے اپنے من پسند شاعر ہوتے ہیں، بعض مقبول اور مشہور شاعر بھی لوگوں کی تنقید کی زد میں آجاتے ہیں۔ لیکن فیض احمد فیض ہر آدمی کے محبوب شاعر ہیں۔ بلکہ بیرون ملک ایسے لوگ بھی ان کی شخصیت اور فن کے عاشق ہیں جو اردو زبان بھی اچھی طرح نہیں جانتے۔۔ ان کی شاعری انسانی دکھوں اور آلام سے عبارت ہے۔ وطن عزیز سے گہری محبت رکھتے تھے۔ ان کا مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ جلیل عالی کا یہ کہنا کہ

"اپنی شعری واردات سے خلوص و دیانت، اپنے آدرش سے سچی کمٹمنٹ اور اپنی فکری و تہذیبی روایت سے پیوستگی کے باعث حاصل ہونے والی اظہار کی شائستگی، زبان و بیان اور لب و لہجے کی شیفتگی نے اقبال کے بعد فیض کو سب سے محبوب اور ہر دلعزیز شاعر بنا دیا ہے۔"

احمد ندیم قاسمی بھی عصر حاضر کے شاعروں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ عموماً نقاد حضرات ان کی شاعری پر، کبھی ان کی افسانہ نگاری کو برتر قرار دیتے ہیں اور کبھی ان کی صحافت کو درمیان میں لے آتے ہیں۔ لیکن یہ بات حیرت انگیز ہے کہ انہوں نے ان تینوں اصناف پر جو گہرے اثرات مرتب کیے ہیں، ان کی حقیقت سے کون انکار کر سکتا ہے۔ وہ بڑے افسانہ نگار تھے اور نہایت نامور صحافی بھی، لیکن ان کی شاعری کا کینوس بھی بہت وسیع ہے۔ جلیل عالی نے ندیم کی شعری واردات کی معنوی جہتیں" میں ان کی شاعری کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھا ہے۔ ان کا کہنا بالکل بجا ہے کہ

"ندیم کی کی تخلیقات کے پیچھے ایک مرکزی تخلیقی واردات کارفرما ہوتی ہے۔ اور زندگی میں معاشرے اور کائنات کے بارے میں ان کے جملہ رویے اور افکار اسی کی روشنی میں مرتب ہوتے ہیں۔ ان کی تمام شاعری یقیناً خدا پرستی، انسان دوستی، ترقی پسندی، ان کی انقلابیت، ان کی ناقابل شکست رجائیت اور ان کی مستحکم پاکستانیت اسی جامع نظریہ حیات و کائنات سے ہم رشتہ ہے، جس کی تعبیر نو اقبال کے فکر و احساس کی صورت میں

ہوئی ہے۔"

احمد ندیم قاسمی کی نجی زندگی کو ان کی شاعری کے آئینے میں دیکھا جائے تو احساس ہوتا ہے کہ دونوں کئی مقامات پر ایک ساتھ چلتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ وہ انتہائی صاف ستھرے اور نفیس کردار کا مجسمہ تھے ان کی غزلوں بالخصوص نعتوں اور نظموں میں ذات باری تعالیٰ کا یقین شدت سے اپنے ہونے کا احساس دلاتا ہے۔ انسانیت سے محبت ان کے خمیر میں شامل تھی۔ جس میں مذہب اور رنگ و نسل کا کوئی امتیاز نہیں تھا۔ وہ جینوئن شاعر تھے اور ان کے تمام فن میں شعری واردات کی جمالیاتی رو دوڑتی ہے۔

"منیر نیازی، پورا شاعر" میں جلیل عالی نے منیر نیازی کی غزل اور نظم پر نہایت فکر انگیز اور سنجیدہ بحث کی ہے۔ انہوں نے اپنی شاعری میں جس تہذیبی تشخص کو دور دور تک پھیلایا ہے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ منیر نیازی اپنی مذہبی اور تہذیبی روایات کے متعلق نہایت اعلیٰ اور منفرد سوچ رکھتے تھے۔ اور یہ سوچ جہاں ان کی غزلوں کے اندر لہو کی طرح چلتی ہے وہاں ان کی نظموں میں معاشرتی اور تہذیبی دروبست ایک مرکز کی حیثیت اختیار کر لیتا ہے۔ انہوں نے چند نعتیہ اشعار کو قرآنی حوالوں سے امر کر دیا ہے۔ ایک شاعر کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن و حدیث کا جم کر مطالعہ اور مشاہدہ کرے۔ علامہ اقبال اس کی سب سے بڑی مثال ہیں۔ قرآن اور دین کی حساسیت کا جتنا انہیں ادراک تھا، شاید وہ کسی اور شاعر کے حصے میں نہیں آیا۔ "جمال عکس و صدا" بھی منیر نیازی کی ایک غزل کے جمالیاتی جوہر کا خوبصورت اظہار ہے۔ اس مشہور غزل کے تمام اشعار نہایت دلپذیر ہیں۔ جلیل عالی نے اس غزل کی ردیف "پیدا ہو" کی جو تصویر کشی کی ہے اور اس میں جو امکانات تلاش کیے ہیں، انہیں انہوں نے نہایت مفصل انداز میں صفحۂ قرطاس پر اتار دیا ہے۔ یہ غزل ہی نہیں ایک نعتیہ مکالمہ ہے، جس میں شاعر نے چند اشعار میں ایک عالم پرو دیا ہے۔ جلیل عالی نے اس غزل کے سارے شعروں کی تشریح کی ہے، وہ زندگی بھر پڑھاتے رہے اور اب قارئین ادب کے آگے انہوں نے غزل کی ساری پرتیں کھول کے رکھ دی ہیں۔

آفتاب اقبال شمیم "ایک خلاق دانشور شاعر" ایک مفصل اور پائے کا مضمون ہے۔ میرا خیال ہے آفتاب اقبال شمیم پر اس سے قبل اتنا عمدہ مضمون یا تو کسی نے نہیں لکھا، اور اگر لکھا ہے تو میری نظر سے نہیں گزرا۔ مصنف کا یہ کہنا حقیقت ہے کہ اردو نظم کی دانشورانہ شعری روایت کے اقبالی تسلسل

میں ن - م راشد، مجید امجد اور جیلانی کامران کے بعد آنے والے شاعروں میں آفتاب اقبال شمیم کا نام بہت نمایاں ہے۔ لیکن بدقسمتی سے پچھلے کئی برسوں سے ہماری نظم کی طرف عمومی رجحان خاصہ کم ہے جب کہ غزل کو زیادہ اہمیت مل رہی ہے۔ لیکن میں سمجھتا ہوں کہ آفتاب اقبال شمیم اپنی نظموں کو جتنی بلندی پر لے گئے ہیں وہ نہایت راحت بخش احساس ہے۔ ان کی نظموں میں ایک جہان آباد ہے۔ جلیل عالی نے اپنی تحریر میں جن عالمی موضوعات کی طرف اشارہ کیا ہے، ان پر ان کی لکھی ہوئی نظمیں دل کو چھوتی ہوئی گزر جاتی ہیں۔

''توصیف کی غزل کے اوصاف لطیف''

توصیف تبسم پر لکھا ہوا جلیل عالی کا یہ مضمون ایک ایسے سینئر درویش غزل گو کو خراج عقیدت ہے جسے میں نے فنون میں پڑھنا شروع کیا۔ ان کی غزل نے ہمیشہ مجھے متاثر کیا۔ بعض اوقات ان کا ایک شعر سارا دن ذہن میں گھومتا رہتا۔ اور میں سوچتا کہ واقعی اللہ تعالیٰ نے انہیں احساسِ لطافت اور نہایت شستہ بیانی سے نوازا ہے۔ اردو غزل کی کلاسیکی روایت کا گہرا شعور ان کی غزل میں کئی مقامات پر محسوس ہوتا ہے لیکن ان کا اپنا انداز ہے اور نہایت سبک ہوا کی طرح لگتا ہے۔ جلیل عالی نے ان کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ دل سے لکھا ہے اور نہایت یادگار جملوں سے اسے مرصع کر دیا ہے۔ وہ اپنے فکر و احساس کو استعاراتی و علامتی تمثالوں کے ذریعے سامنے لاتے ہیں، یہی نہیں بلکہ وہ اپنی شعری واردات کی تصویر کشی کے لیے ایک ملازماتی فضا بھی بناتے ہیں۔ ان کی تلازمہ کاری میں جس طرح ایک ہی ماحول کے انسلاکات کا اہتمام ہوتا ہے، اس کے پیشِ نظر اسے مراعات النظیری تلازمہ کاری کا نام بھی دیا جاسکتا ہے۔

''حفیظ تائب کی نعت گوئی کا غزلیہ آہنگ''

حفیظ تائب کی نعت گوئی پر ایک عمدہ مضمون ہے۔ نعت شاعری کے بدن میں دل کا درجہ رکھتی ہے۔ دل دھڑکتا ہے تو نعت کے رنگ قوسِ قزح کی طرح فضا میں پھیل جاتے ہیں۔ حفیظ تائب وہ خوش بخت شاعر ہیں کہ آغاز میں غزل گو کی حیثیت سے منظر عام پر آئے اور پھر قدرت نے انہیں صرف نعت کے لیے چن لیا۔ انہوں نے اپنے مداحوں کو مایوس نہیں کیا بلکہ سرشار کیا ہے۔ عشق رسولؐ کا راستہ بہت کٹھن ہے لیکن انہوں نے اس راستے سے کانٹے اور پتھر ہٹا کر اسے رنگ برنگے پھولوں کی خوشبو سے نہلا دیا ہے۔ انہوں نے نعت کو آخرت کا توشہ بنا لیا ہے۔ ان کی نعتوں میں قرآنی آیات، سیرت و حیات طیبہ، احادیث اور جذبوں کی شدت سب موجود ہیں۔ جلیل عالی نے ان کی

نعت گوئی میں بھی غزل کا آہنگ تلاش کر لیا ہے اور یہ بات دل کو لگتی ہے۔

احسان اکبر بھی آفتاب اقبال شمیم کی طرح موجودہ اردو نظم میں ایک اہم شاعر کے طور پر تسلیم کیے جاتے ہیں۔ قومی وجود، تہذیب و تمدن اور عالمی موضوعات پر ان کا مطالعہ اور مشاہدہ ایک حیرت انگیز تجربہ ہے۔ ان کی اکثر نظمیں وجدانی کیفیت میں کہی ہوئی معلوم ہوتی ہیں جنہیں پڑھ کر قاری کسی اور جہاں میں پہنچ جاتا ہے۔ جلیل عالی نے ان نظموں کے مجموعے ''ہوا سے بات کی بازگشت'' کے آغاز میں ان کی نظموں کی ہمہ گیری کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور ان کی نظموں کے کچھ اقتباسات اپنے مضمون میں غور کے لیے قارئین کے آگے رکھے ہیں جو تفصیلی تنقیدی مطالعے کے متقاضی ہیں۔ ان کی نظموں کا یہ مجموعہ غیر معمولی لگتا ہے۔ اس میں پاکستانی کلچر، مسلمانوں کا الگ تشخص اور اردو زبان کی اہمیت کے فطری تخلیقی بہاؤ کو بڑی مہارت سے نظموں میں سمو دیا گیا ہے۔ جلیل عالی کا یہ کہنا کہ احسان اکبر اپنے قاری کو فکر و احساس کی ایک اور ہی دنیا میں لے جاتے ہیں بالکل بجا ہے۔

خالد احمد اردو غزل کی کلاسیکی روایت کے شاید آخری صاحب توفیق شاعر ہیں۔ ان کا تخلیقی سفر ان کے چلے جانے تک نہایت باوقار اور توانا انداز میں آگے بڑھتا رہا۔ جلیل عالی نے اپنے مضمون ''نم گرفتہ بہ دم غزل'' میں پوری غزل کا شاعر لکھا ہے اور یہ ان کے فن کا کھلا اعتراف ہے۔ خالد احمد غزل اور نظم دونوں کے لاجواب شاعر تھے۔ وہ ایک دانشور بھی تھے اور دور رس نگاہ رکھتے تھے۔ جلیل عالی ان کی شخصیت اور فن پر تحریر کردہ مضمون کے ایک اقتباس میں نہایت عمدہ اور اہم جملے کہتے ہیں، جس سے ان کے فن کی سمت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ وہ ایک جگہ یوں رقم طراز ہیں۔

> ''خالد احمد نے اقبالی تحریک کے تسلسل میں سخن آراء ہونے والے احمد ندیم قاسمی کی صحبتوں میں اپنے پورے تہذیبی وجود سے وفا کا وتیرہ اکتساب کیا۔ یہاں پورے تہذیبی وجود سے مراد زندگی کے نفسیاتی، معاشرتی اور کائناتی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ مابعد الطبیعاتی اور روحانی سطحوں کی شمولیت بھی ہے۔ خالد احمد کے ہاں ان سطحوں کا اظہار صرف اس کے بے مثال حمدیہ و نعتیہ قصیدوں اور سلاموں ہی میں نہیں ہوا، بلکہ اس کی نظموں اور غزلوں میں بھی یہ اس کی تخلیقی واردات کا لازمی جزو ہیں۔''

☆☆☆☆☆

شعراء کے رجحانات

درست یہی ہے کہ رومان اردو شاعری کا سب سے بڑا موضوع ہے۔ اظہار محبت کے ہزارہا قرینوں کے باوجود مزید امکانات موجود ہیں۔ عام مشاہدہ ہے کہ شعرا اس خاص اور پسندیدہ موضوع کے دائرے سے باہر نہیں نکلتے ہیں لیکن موجودہ سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کا تقاضا ہے کہ محبت کے دائرے کو وسعت دے کر عوامی مشکلات کو زیر بحث لایا جائے۔ مہنگائی، بیروزگاری اور معاشی ناہمواری کے باوجود محبت کی شاعری کا جواز سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ سخت معاشی دباؤ میں بانسری کی دھن لطف نہیں دیتی ہے۔ شاعری کے فرسودہ تصوراتی ڈھانچے کو توڑنے کی ضرورت ہے۔ منظر نامے پر موجود قد آور شعرا محبت کی شاعری سے لوگوں کو مسحور کرتے ہیں۔ نئے شعرا میں عامیانہ پن دیکھنے میں آ رہا ہے۔ بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اپنے اردگرد کے حالات سے قطعی لاعلم ہیں۔ دراصل وہ پاپولر ہونے کی دوڑ میں شامل ہیں اور نوجوانوں کے جذبات سے کھیلتے ہیں۔ یہ سطحی سوچ شعرا کو خاص موضوع تک محدود کر دیتی ہے۔ ایسی شاعری کی عمر بہت کم ہوتی ہے۔ سچی شاعری سماجی مسائل کو نظر انداز کر کے نہیں لکھی جا سکتی ہے۔ یہ امر قابل تشویش ہے کہ جن شعرا کی آواز ایوانوں تک پہنچ سکتی ہے، انھیں عوامی معاملات سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ادبی تاریخ میں محض فن ہی نہیں موضوع کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ موضوعاتی دائرہ کار بڑھانے کی اشد ضرورت ہے۔ مشاعرے میں داد نے شعراء کو خراب کر دیا ہے۔ معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی معاملات پر لکھنے والے انگلیوں پر گنے جا سکتے ہیں۔ شاعری کا پہلا فریضہ یہی ہے کہ ظلم کے

شاہد اشرف

خلاف آواز بلند کی جائے۔ اگر شعرا ایسا نہیں کرتے ہیں تو وہ ضمیر کی عدالت میں جواب دہ ہیں۔ آپ ہرگز غیر جانب دار نہیں ہیں۔ غیر جانب داری ظلم کا ساتھ دینے کی صورت خیال کی جاتی ہے۔

شعرا کی بڑی تعداد اپنے ذاتی نقطۂ نظر کی بنیاد پر احتجاج سے پہلو تہی اختیار کرتی ہے۔ ناپسندیدہ اقدامات پر چشم پوشی اور غیر متوازن عوامل سے بے توجہی کے نتیجے میں عوام کی شعرا سے وابستہ توقعات مجروح ہوتی ہیں۔ آہستہ آہستہ شعرا خود بھی سماجی اور سیاسی موضوعات سے لاتعلق ہو جاتے ہیں اور عوام بھی انھیں محض خواب و خیال کی دنیا میں مگن فالتو لوگ قرار دے دیتے ہیں۔ چند شعرا کھلی آنکھوں سے حالات کا جائزہ لیتے ہیں مگر مصلحت کی بنا پر خاموش رہتے ہیں۔ بہت قلیل تعداد میں شعرا مزاحمت کرتے ہیں۔ شعرا کی مقبولیت مزاحمت کے گراف کو متعین کرنے میں مدد دیتی ہے۔ یہاں کم یا زیادہ مقبول شاعر اہمیت کا حامل ہے۔ مزاحمت کی نوعیت اور اثرات شاعر کا سماجی و سیاسی کردار طے کرتے ہیں۔ اس جدوجہد میں کبھی کبھی ناگفتہ بہ صورت حال اور دگرگوں حالات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ مجموعی معاشرتی بے حسی اور بوکھلاہٹ کی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ موجودہ شاعر کسی بھی طرح کا رسک لینے پر آمادہ نہیں ہے۔ معروف اور معاشی اعتبار سے مستحکم شعرا نے راز حیات پا لیا ہے۔ وہ جز وقتی مفادات پر قانع ہو گئے ہیں۔ صرف مشاعرے کا اعزاز یہ ہی مقصد حیات بن گیا ہے۔ گزشتہ دہائی میں قومی سطح پر کسی بڑے مزاحمتی شاعر کی عدم موجودگی کئی سوالات جنم دیتی ہے۔ یہ بات درست ہے گزشتہ دہائی میں سینئر شعرا کی وفات سے بڑا خلا پیدا ہوا ہے مگر ان سے پچھلی صف میں موجود شعرا یکسر مزاحمتی رویوں سے عاری دکھائی دیتے ہیں۔ یہ افسوس ناک صورت حال غمازی کرتی ہے کہ اردو شاعری کا مستقبل تاب ناک نہیں ہے۔ نوآبادیاتی دور میں اردو شعراء کا کردار فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ قیام پاکستان کے بعد بھی شعرا کئی محاذوں پر برسرپیکار دکھائی دیتے ہیں۔ گزشتہ دو سیاسی ادوار اس بڑے شاعر سے محروم ہیں جس کے لہجے سے ایوانوں میں ہلچل مچ سکتی ہے۔ میں مایوس نہیں ہوں صرف تشویش کا اظہار کر رہا ہوں۔

دائیں اور بائیں بازو کی تخصیص ختم ہونے سے ادب کو نقصان پہنچا ہے۔ بائیں بازو کو اسلامی سوشلزم کے نعرے کی کشش نے مدار سے باہر کر دیا۔ بعد ازاں انھیں مختلف این جی اوز میں پناہ مل گئی۔ دائیں بازو کو ایوارڈز اور ادبی و ثقافتی عہدوں نے جدوجہد سے عاری کر دیا۔ دونوں مختلف نظریات کے

حامل ادبا الگ الگ انقلاب کی کوشش میں شامل تھے۔ دونوں نظام سے نالاں اور بے زار تھے۔ نظام سے چھٹکارے کے لیے کبھی مشترکہ جدوجہد کا خیال سامنے نہیں آیا۔ اس کی بنیادی وجہ مختلف فلسفہ حیات قرار دیا جاسکتا ہے۔ غریب سے خدا کو چھیننے کی کوشش بھی بنیادی وجوہات میں شامل ہے۔ سوویت یونین کے خاتمے سے نفسیاتی سطح پر سخت دھچکے کے باعث رفتہ رفتہ ادبی محاذ پر خاموشی چھا گئی۔

دائیں بازو نے محاذ خالی دیکھ کر پہلوتہی اختیار کرلی۔ گزشتہ تین دہائیوں سے دونوں طرف غیر اعلانیہ سیز فائر ہو چکی ہے۔ اس دوران میں دونوں جانب سے کوئی قابل ذکر تحرک پیدا نہیں ہوا ہے۔ بڑی تعداد میں شعراء مسلسل لکھ رہے ہیں اور ان کا زندگی کے حوالے سے کوئی نقطہ نظر نہیں ہے۔ یعنی شاعری کسی نظریے کے بغیر لکھی جا رہی ہے۔ مسافر کو منزل کا تعین ہی نہیں ہے۔ کسی نقطہ نظر کے بغیر لکھی شاعری کا مستقبل کیا ہوگا؟ گزشتہ کئی دہائیوں سے ملکی نظام میں کوئی دراڑ واقع نہیں ہوئی ہے۔ انقلاب کا لفظ کلیشا ہو گیا ہے۔ اگر کوئی شاعر حالات پر دل گرفتہ ہوتا ہے تو قابل اعتنا نہیں سمجھا جاتا ہے۔ حل غربت، پسماندگی اور مسائل شعری اظہار کا پامال موضوع گردانا جاتا ہے۔ ادبی گروہ بندی نے بھی شعرا کو ذہنی طور پر منجمد کیا ہے۔ وہ تغیرات سے لاتعلق اور حالات سے بے پروا صرف لذت سماعت کے دلدادہ ہیں۔ سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ عوام کی توقعات بھی یہی ہیں۔ اس موج میں اضطراب کا امکان مفقود ہو رہا ہے۔

اس عرصے میں دو باتیں قابل توجہ ہیں۔ پہلی بات یہ کہ نعتیہ شاعری کو بے حد فروغ حاصل ہے۔ ایک اعتبار سے یہ خوش آئند ہے کہ نعتیہ تناظر میں سماجی، سیاسی اور ذاتی زندگی کے مسائل بھی زیر بحث لائے گئے ہیں۔ البتہ ان مسائل کے حل کے لیے اجتماعی سطح پر عملی جدوجہد موجود نہیں ہے۔ نعتیہ حلقوں کو مذہبی حمایت حاصل ہے اس لیے نعت خوانی اور نعت گوئی کو مسلسل تقویت مل رہی ہے۔ اشرافیہ کو ان سے کوئی خدشہ نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ فیمنزم کی مقبولیت کا گراف اوپر جا رہا ہے۔ شاعرات کی کثیر تعداد نے عورت کے مسائل کو موضوع بحث بنایا ہے۔ شعراء بھی پیش پیش ہیں۔ ادبی حلقوں میں بھی اس موضوع کو پذیرائی حاصل ہے۔ پاکستان میں خواتین کی تعلیم و ترقی کے لیے ناسازگار حالات بھی اس موضوع کی تقویت کا سبب ہیں۔

مزاحیہ شاعری کی مستحکم روایت کے باوجود گزشتہ دہائیوں میں مزاح کے نام پر بیویوں، سالوں اور سالیوں کی خوب شامت

آئی ہے۔ اس سے عوامی مزاج بگڑ کر رہ گیا ہے۔ سٹیج ڈرامے، اور مزاحیہ شاعری دونوں رو بہ زوال ہو گئے ہیں۔ مزاح میں شائستگی، تازگی اور تربیت کا رول ختم ہو گیا ہے۔ اس کی جگہ پھکڑ پن، بے ہودگی اور ہزل گوئی نے لے لی ہے۔ مزاحیہ شاعری میں پنجابی، انگلش اور ہندی ڈکشن سے ندرت پیدا کرنے کی کوشش بھی تا دیر ساتھ نہیں دے پائی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شاعری میں اصلاح احوال اور ہمدردانہ شعور کے عناصر موجود نہیں ہیں۔ جز وقتی خوشی کا تصور دائمی مسرت پر غالب آ گیا ہے۔ ایسی شاعری کی لائف نہیں ہوتی ہے۔ البتہ کچھ شعرا نے جدا رستہ نکالا ہے اور موضوعاتی سطح پر تنوع دیکھنے میں آیا ہے۔ انھوں نے معاشرتی، سیاسی اور معاشی ناہمواری پر کھل کر لکھا ہے۔ اداروں میں سالانہ مشاعرے ہوتے ہیں اور مزاحیہ شعرا کو خوب پذیرائی حاصل ہوتی ہے۔ اعزازیہ بھی ملتا ہے، کئی سنجیدہ شعرا بھی مزاح کے میدان میں جگہ بنانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔ گزشتہ تین دہائیوں میں ایک مزاح گو شاعر نے محتاط اندازے کے مطابق اپنی ہر ایک نظم پر ایک کروڑ روپے سے زیادہ اعزازیہ وصول کر لیا ہے۔ میں ہرگز کسی منفی سوچ کا حامل نہیں ہوں۔ صرف عرض کر رہا ہوں کہ نعت گوئی اور مزاحیہ شاعری روزگار کی حیثیت اختیار کر گئے ہیں۔ ایک عظیم مقصد فراموش کر دیا گیا ہے۔ کبھی کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے معاشرتی، سیاسی اور معاشی مسائل سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک سازش کے تحت ایسے شعرا کو میڈیا کے ذریعے متعارف کروایا گیا ہے تا کہ عوام محض ہنسنے ہنسانے میں مگن رہیں اور سنجیدگی سے حالات کا جائزہ نہ لیں۔

مقصدیت سے پہلو تہی اور مسائل سے لاتعلقی کا خمیازہ اخلاقی زوال کی صورت میں بھگتنا پڑا ہے۔ عوامی مذاق کا یہی تقاضا ہے کہ سطحی اظہار اپنایا جائے۔ ہمارے شعرا عوام کی توقعات پر پورا اترے ہیں۔ یوں فکر وفن کو قربان کر دیا گیا ہے۔ مزاحیہ شاعری کا فکری وفنی جائزہ لینے اور اس پر سخت تنقیدی مضامین لکھنے کی اشد ضرورت ہے۔ یہ ایسا میدان ہے جس میں درست سمت کے تعین سے مطلوبہ مقاصد کا حصول ممکن ہو سکتا ہے۔ اس وقت اس امر کی جانب توجہ دینے سے آئندہ کے شعری منظر نامے پر مثبت اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ مزاحیہ شاعری کو حد درجہ پذیرائی کی وجہ سے شعرا کو زندگی سے جڑے معاملات کو پیش کرنا چاہیے۔

یہ گزشتہ تین دہائیوں میں شعری رجحانات کا مختصر جائزہ ہے۔ اسے سامنے رکھ کر مزید رجحانات کا پس منظر سمجھنے میں مدد مل سکتی ہے۔

☆☆☆☆☆

فیض احمد فیض

فیض صاحب کو جن لوگوں نے سُنا دیکھا یا اُن کے قریب رہے ان کا بیان ہے کہ ایسی سحر آمیز شخصیت کم دیکھنے کو ملتی ہیں ان میں ضبط، تحمل، بردباری کمال درجہ کی تھی شائستگی کو کبھی ہاتھ سے نہیں چھوڑا تھا۔ اُن کی شخصیت پر سنگ باری یا اُن کے اشعار کے ردیف و قافیہ اور وزن میں نقص کاری کا ہُنر دکھانے والوں کو کبھی جواب نہیں دیا۔ اپنی روزمرہ زندگی اور سیاسی نظریات پر تنقید اور الزام تراشی کرنے والوں کی باتوں کو سُنا مگر خاموش رہے۔ فیض صاحب نے اپنے لفظ کو کبھی گندہ نہیں ہونے دیا:

درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں

.....

فیض صاحب کا عہد جو تقریباً 80 برس پر محیط ہے۔ باکمال شاعروں کے ناموں سے روشن ہے۔ اقبال (حیات تھے) جوش ملیح آبادی، جگر، مجاز، اختر شیرانی، حفیظ جالندھری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، ابنِ انشا، احمد فراز، منیر نیازی، حبیب جالب، ساحر لدھیانوی، ناصر کاظمی، قتیل شفائی، کیفی اعظمی، راجہ مہدی علی خاں، مجروح سلطان پوری، حسرت موہانی، ن م راشد،

محمد حنیف

حفیظ تائب، زہرہ نگاہ، پروین شاکر وغیرہ اس دور میں غزل، نظم گیت، نعت، ترقی پسند ادب، مزاحمتی ادب کلاسیک کا درجہ رکھتی ہے اور یہ "عہدِ فیض" شاعری کے ساتھ فنونِ لطیفہ اور نثر میں بھی ناول، افسانہ، تنقید، تحقیق، سوانح، انٹرویوز، طنز و مزاح، بین الاقوامی نوبل ادب کے تراجم چیلنجز، فکری خطاب، شرح و تفسیر میں بھی اک تاریخی اور زندہ مقام رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ ادبی، فکری ادارے، نشستیں۔ آرٹ، شخصیات، بیشتر تخلیقات بین الاقوامی معیار کی پیش ہوئیں۔ یقیناً یہ 80 سالہ دور فنونِ لطیفہ، فن تعمیر، موسیقی، گیت، سنگیت، گائیک اور گائیکی، غزل، ٹھمری، رقص، تہذیب، رنگا رنگ خوبصورتیوں کی بلندی کو چھو رہی تھیں۔ جنگ کی تباہ کاریوں کے ساتھ نو آبادیاتی نظام دم توڑ رہا تھا۔ سائنس، طب اور ہر شعبہ جات میں عقل کو دنگ کرنے والی ایجادات اور انکشافات ہو رہے تھے۔

فیض صاحب کے کلام میں نرم و لطیف جذبات کی ترجمان اور جمالیاتی حسن حساس دلوں میں گداز کے ساتھ فکر کی کیفیات وسیع تر تصورات کے کینوس پر خواہشات کی نقش نگاری سے محفوظ کرتا ہے۔ فیض صاحب کی زندگی جلا وطنی، جیل، مقدمہ بازی جیسے تلخ واقعات سے بھری ہے، مگر اُن کے لہجہ میں تلخی، مایوسی، انتقام والا تاثر بالکل نہیں ملتا۔ ان کے اشعار تو غمِ دوراں۔ مسائل انسانیت اور حقوقِ اقوام کے ترجمان ہیں۔ فیض صاحب عظیم انسان تھے۔ دوستوں کی خوشی کے لیے روایتی، رواجی رسوم کو بیچ میں نہیں لاتے تھے۔ مثلاً خالد حسن صاحب لکھتے ہیں۔ واجد علی نے فیض صاحب کو کربلا گامے شاہ لیجا کر اپنے تصنیف کردہ بہت زوردار مرثیے پڑھائے یعنی فیض صاحب کو اعزازی شیعہ بنا دیا۔

فیض صاحب کی شخصیت اور ان کے کلام کو پڑھ کر میری بھی یہ خواہش رہی کہ خود بھی اس قطار میں دیکھو جو فیض صاحب سے تعلق اور ملاقاتوں کی باتیں سنانے کا فخر رکھتے ہیں۔ لہٰذا

جب فیض صاحب ___ جلاوطنی ختم کر کے وطن لوٹے تو میں نے بہت محترم اور مرد آہن دوست پروفیسر امین مغل صاحب سے عرض کی آپ فیض صاحب کے قریبی دوستوں میں سے ہیں۔ فیض صاحب آپ کی بات سنتے بھی ہیں اور مانتے بھی ہیں۔ آپ فیض صاحب کو میرے گھر تشریف لانے کی دعوت دیں اور ساتھ دوستوں کو بھی۔ اور اگر ایسا ممکن نہیں تو پھر فیض صاحب کے اعزاز میں کسی دوستوں کے ہاں نشست ہو تو مجھے ساتھ لے کر چلیں۔ فیض صاحب کو قریب بیٹھ کر سننے کا مجھے بے حد اشتیاق ہے۔

پروفیسر امین مغل صاحب نے میری بات کو

سنا اور اپنے مخصوص سنجیدہ لہجہ میں فرمایا۔
''اچھا آپ کے لیے کچھ کرتے ہیں۔''
اگرچہ فیض صاحب سے ملنے اور اُن کو سننے کا مجھے تین بار اتفاق ہوا تھا۔ پہلی دفعہ گورنمنٹ کالج میں جہاں فیض صاحب کے اعزاز میں مشاعرہ تھا دوسری بار باہمت انسان اور دوست قمر یورش صاحب کی کتاب کی تقریبِ رونمائی میں جو پاک ٹی ہاؤس میں فیض صاحب کی صدارت میں ہوئی تھی۔
اس تقریب میں فیض صاحب نے قمر یورش کو ''قلم کا مزدور'' کا خطاب دیا تھا۔ قمر یورش نے اپنے مضمون میں اور طرح سے بات کی ہے مگر مجھے یہ بتایا تھا کہ پروگرام کو ترتیب دینے میں اور فیض صاحب کو تقریب میں لانے میں سب کردار پروفیسر امین مغل صاحب کا تھا۔ تیسری ملاقات فلیٹیز ہوٹل میں اُن کے اعزاز میں تقریب میں ہوئی تھی اُس وقت فیض صاحب بہت بیمار تھے اور کمزور بھی کافی ہو گئے تھے۔ اس موقع پر اُن کی خدمت میں ہندوستان میں شائع ہونے والے رسالہ ''فن و شخصیت'' کا ''فیض نمبر'' پیش کیا اور گزارش کی اس پر دستخط فرما دیں۔
''فیض نمبر'' پر آٹو گراف دیتے ہوئے فیض صاحب نے خوشی اور حیرت کا اظہار کیا اور پوچھا ہندوستان سے کتابیں اور رسائل منگوانے پر پابندی ہے آپ نے کیسے منگوا لیا؟ میں نے اُن کو بتایا ایک دوست حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے عرس پر گئے تھے انھوں نے لا کر دیا تھا۔ فیض صاحب کے ساتھ کشور ناہید صاحبہ نے بھی اپنے جذبات کا اظہار اس ''فیض نمبر'' پر لکھ کر دیا۔
پروفیسر امین مغل صاحب سے اپنی خواہش کا اظہار کیے چند روز ہی ہوئے تھے کہ پروفیسر ذکی درانی صاحب تشریف لائے انھوں نے کہا امین مغل صاحب کا پیغام ہے کہ فیض صاحب کے ساتھ ایک نشست نصیر اے شیخ صاحب کے گھر کینٹ میں ہے تم نے بھی وہاں آنا ہے۔ درانی صاحب نے ہاتھ سے لکھا اِک کارڈ دیا جس پر نصیر اے شیخ صاحب کے گھر کا پتہ تاریخ اور وقت درج تھا اس پر میں نے پروفیسر امین مغل صاحب کا شکریہ ادا کرنا چاہا، مگر دوستوں سے شکریہ وصول کرنے کے قائل نہ تھے۔
مقررہ تاریخ پر میں اپنے دوست اقبال احمد خان کے ساتھ نصیر اے شیخ صاحب کی کوٹھی واقع کینٹ پہنچا۔ وہاں شفیق شخصیات دانشور عثمانی صاحب، آئی اے رحمٰن صاحب، حسین نقی صاحب تشریف فرما تھے اور دولتانہ احمد سعید کرمانی صاحب، اعتزاز احسن صاحب، فخر زمان صاحب، احمد بشیر صاحب، عابد حسن منٹو صاحب، حمید اختر صاحب اور احباب فیض موجود تھے۔
ماحول انتہائی پُر وقار تھا۔ گفتگو فیض صاحب کے بارے میں اور سیاسی قسم کی ہو رہی تھی۔
تھوڑی دیر بعد فیض صاحب بھی تشریف لے آئے سب نے کھڑے ہو کر اُن کا

استقبال کیا۔ خوشی اور محبت کا تاثر سب کے چہروں سے جھلک رہا تھا۔ کچھ نے ہاتھ ملایا۔ حال احوال پوچھا اور پھر فیض صاحب سے کلام سنانے کی فرمائش ہوئی۔

فیض صاحب نے مختصر تمہید میں فرمایا سفر کے دوران ایک نظم ہوئی ہے آپ کو پہلے وہ سناتے ہیں۔

نظم تھی ــ دلِ من مسافرِ من

میرے دل میرے مسافر
ہوا پھر سے حکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تم
دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یار نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا
سرِ کوئے ناشناساں ـــــ
ہمیں دن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا برا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

....

آمریت نے جو ملک کی صورت بگاڑ دی تھی۔ حریت پسند دوستوں سے جو سلوک ہو رہا تھا۔ بھٹو کی پھانسی قید و جلاوطنی اس پس منظر میں نظم نے جو کیفیت پیدا کی اُس کا اندازہ احساس کی آنکھ سے آج بھی محسوس کیا جا سکتا ہے نظم کے ایک ایک مصرعہ پر واہ واہ ہو رہی تھی۔ فیض صاحب نے اُس کے بعد اپنا اور کلام بھی سنایا شعر و شاعری کی یہ محفل ڈیڑھ دو گھنٹے جاری رہی اُس کے بعد چائے کا دور تھا جہاں ہر شخص فیض صاحب سے مصافحہ کرنے کا مشتاق تھا۔ شام گئے جب یہ محفل ختم ہوئی تو واپسی پر یوں لگ رہا تھا کہ بغیر پیئے ذہن و وجود میں نشہ سرایت کر رہا ہے۔

یہ نشست میرے لیے آج بھی اک یادگار اور خاص تقریب ہے اور یہ بات میرے لیے قابلِ فخر ہے کہ فیض صاحب سے ملا۔ اُن کو دیکھا۔ اُن سے باتیں کیں۔ اُن کا کلام اُن کی زبانی سُنا۔

فیض صاحب کی شاعری کرۂ ارض کے سب انسانوں کے لیے آفاقی شاعری ہے وہ دنیا کو ایک خوبصورت اور امن و شانتی کی جگہ دیکھنا چاہتے تھے جہاں ہر آدمی کو انصاف مساوات، حقوق، وقار اور عزتِ نفس ملے۔ اُن کی نظموں اور غزلوں میں جہاں انسانی جذبوں کی کیفیت کے رنگ ہیں وہاں تاریخ کے عمل کا تناظر بھی ملتا ہے اُن کی شاعری نے حق پرستوں کو جدوجہد، حوصلہ، تقویت اور باطل کے سامنے ڈٹ جانے کی تحریک

دی ہے عظمتِ انسان ان کا مقصد تھا۔
ناقدینِ ادب کی رائے ہے کہ شاعری میں علامہ اقبال کے بعد جو عہد ہے وہ فیض احمد فیض صاحب کا عہد ہے۔
کیا پوسٹ مین کیا لیڈر، کیا سیاستدان وکیل، وطن پرست، عشاق، مولوی وغیرہ اپنی گفتگو اور تقاریر میں جوش و حسن اور بلاغت پیدا کرنے کے لیے کلام فیض کا سہارا لیتے ہیں:

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیض گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

.....

بقول سجاد ظہیر ___ فیض کے کلام میں گرمی بھی ہے حرکت بھی اور توانائی بھی۔
فیض صاحب نے تعصب رکھنے والوں کو نہ کبھی جواب دیا نہ اُن کے بارے میں کبھی نفرت یا غصہ کا اظہار کیا۔ ان کی اسی صفت کی بنا پر اُن کو ملامتی صوفی بھی کہا گیا ہے۔
فیض صاحب تو محبت اور خلوص کے انسان تھے۔
نقادوں، تجزیہ نگاروں، دانشوروں اور احباب نے فیض صاحب کی شاعری اور شخصیت پر ہزاروں صفحات تحریر کیے ہیں۔
فیض صاحب کو بحیثیت شاعر اور انسان جاننے کے لیے ان ہزاروں صفحات میں سے چند مقتدر صاحبِ قلم کی رائے اختصار کے ساتھ پیش ہے، جس سے فیض صاحب کے ہر پہلو کی عکاسی نظر آئے گی۔

پروفیسر کرار حسین صاحب: فیض وہ شاعر ہیں جنھوں نے ہمیں زندہ لفظ دیا، فیض زندہ لفظ کے شاعر ہیں:
احتشام حسین صاحب: فیض نے اپنے انسان دوست خیالات، زندگی میں ناانصافی اور عدم توازن کے خلاف اپنے صحت مند ردِعمل اور انفرادی تجربات کو ایسے حسین شعری پیکر میں قلم بند کیا ہے کہ جو لوگ ان کے نصب العین کے مخالف ہیں وہ بھی اس کے اثر اور جادوئی گرفت سے آسانی کے ساتھ باہر نہیں نکل سکیں گے۔
احمد ندیم قاسمی صاحب: فیض کی شاعری کا آغاز رومان و جدان میں لپٹا ہوا ہے مگر جلدی ہی زندگی کے کڑے اور تلخ حقائق اس خول کو چٹخا دیتے ہیں۔ اور وہ ذاتی دکھ کے ساتھ ہی عالم انسان پر مسلط دوسرے دکھوں کی جلن بھی اپنے اندر محسوس کرنے لگتے ہیں۔ ان کے فن میں محبت اور حقیقت کا یہ امتزاج وہ جادو جگاتا اور وہ طلسم طاری کرتا ہے کہ اردو شاعری کے کم ہی بڑے نام اس خصوصیت میں فیض کے مقابل لائے جا سکتے ہیں۔
ڈاکٹر محمد علی صدیقی صاحب: شاعری فیض کے لیے مشغلہ ہے نہ مشاعرے لوٹنے کا حربہ۔ یہ ایک سنجیدہ کام ہے جو جامِ جم بھی ہے اور جامِ جہاں نما بھی۔ جبھی تو وہ "حذر کرو میرے تن سے" ___ میں کہتے ہیں:
سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلہ

کسے لبھائے گا میرے لہو کا واویلا

سبطِ حسن: فیض صاحب کے نزدیک انقلاب کی راہ حیات بخش اور مرگ آفریں قوتوں کے مابین تصادم سے ہوکر گزرتی ہے۔

اِس اجتماعِ ضدین سے ان کے کلام کی اثر انگیزی میں بہت اضافہ ہوا ہے۔ سوچ کا یہ انداز ہم کو نظموں کے علاوہ اُن کی تشبیہوں اور استعاروں میں بھی ملتا ہے۔ فراق ظلمت و نور۔ داغ داغ اُجالا۔ شب گزیدہ سحر۔ روز وصل کی راحتیں۔ حق باطل اور سرمایہ و محنت۔ غرضیکہ بے شمار ترکیبیں ہیں۔ جو فیض صاحب کی جدلی رمزیات کی انفرادی خصوصیت ہے۔

قرۃ العین حیدر صاحبہ: فیض کی شاعری کبھی کمھلا نہیں سکتی۔ یہ ایسی شاعری ہے جسے آج فلسطین اور ایران الجیریا کا شاعر پہچان سکتا ہے۔ میر، غالب، اقبال بھی اسی کو پسند کرتے اور پنجاب کے بلھے شاہ اور وارث شاہ اور بابا فرید بھی۔

ڈاکٹر انا سود ورا: فیض کی شاعری اپنے زمانے کے سیاسی اور سماجی مسائل کا اظہار کرتی ہے۔ فیض کی اس اعتبار سے نئی غزل ہے کہ انھوں نے اردو غزل میں روایتی لفظیات اور اشارات کو عصری مسائل سے آشنا کیا۔ فیض نے گھر اور غربت کے روایتی موضوع کو تازہ کیا اور اس طرح انھوں نے وطن سے دوری اور سیاسی جلاوطنی کا نیا موضوع پیدا کیا۔

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیض ذکرِ وطن اپنے روبرو ہی سہی

ڈاکٹر شارب ردولوی صاحب: فیض کے کلام کی ایک بڑی خصوصیت ان کے استعارے کا استعمال ہے۔ فیض نے عام طور پر تشبیہہ سے کم استعارے سے زیادہ کام لیا۔ جو ان کی ذہانت اور شدت احساس کی نشان دہی کرتا ہے۔ تشبیہ خود کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو وہ اپنے معنی یا مفہوم میں مثال سے آگے ہیں بڑھتی لیکن استعارے میں معنوی تہ داری اور اشارتی پہلو نہاں ہوتے ہیں۔ فیض کی یہ خوبی ہے کہ وہ پرانے اور روایتی الفاظ سے نئے استعارے تخلیق کرتے ہیں اور ان استعارات سے دوہرا تاثر پیدا کرتے ہیں۔

پروفیسر امین مغل صاحب: فیض کے ہاں بیان میں جو سلاست آگئی ہے وہ تکلم کے ردھم کے قریب آتی گئی ہے۔ خاص طور پر بلینک ورس میں فیض یوں چلتے ہیں جیسے بول رہے ہوں۔ جیسے ایک پڑھا لکھا مہذب شخص کلام کر رہا ہو۔ بلینک ورس ان کے ہاں آکر موم ہوگئی ہے۔

ممتاز حسین صاحب: وہ بسا اوقات تشبیہ سے زیادہ استعارے اور استعارے سے زیادہ کسی ایک صنف کے الفاظ سے اپنا کام نکال لیتے ہیں۔ یہیں پر وہ غالب کے فن کے زیادہ قریب ہیں۔

قدرت اللہ شہاب صاحب: 1972 میں جب پاکستان نیشنل آرٹ کا قیام عمل میں آیا تو فیض نے چیرمین کے طور پر اس کی سربراہی قبول کرلی - ایک روز فیض نے مجھے فون کیا کہ بہت ساری فائلیں جمع ہوگئی ہیں میں انھیں لے کر تمھارے پاس کس وقت آجاؤں۔ فیض کے منہ سے یہ بات سن کر مجھے بڑی ندامت محسوس ہوئی۔ میں نے سوچا میرے جیسے دو دو ٹکے کے بیوروکریٹ تو ہر حکومت ہر زمانے میں ٹھوکر کے بھاؤ ملتے رہتے ہیں لیکن فیض تو نہ جانے کتنی صدیوں کے لیے فقط ایک ہی فیض ہے۔ چنانچہ میں نے کبھی انھیں فائلیں لے کر اپنے پاس آنے کا موقع نہیں دیا۔

مشتاق احمد یوسفی صاحب: کچھ دیرینان شبینہ کا نشہ چڑھا تو اُن صاحب نے فیض صاحب کی ایک بہت ہی حسین نظم ''تنہائی'' کے بارے میں ارشاد فرمایا۔ نظم اچھی ہے مگر سنسان بہت ہے اس میں تنہائی ایسے محسوس ہوتی ہے جیسے لندن میں سردی یعنی لگتی ہے تو لگتی ہی چلی جاتی ہے۔ کم از کم ایک لائن میں محبوبہ کو ڈالیے۔ ان کا اصرار بڑھا تو فیض صاحب چائے کی چسکی ایک سریلی سسکی کے ساتھ لیتے ہوئے بولے__ ہاں بھائی ی۔ ی۔ اگلے ایڈیشن میں ڈال دیں گے۔

ایلس فیض صاحبہ: سوٹ بنوانا اس زمانے میں ایک عیاشی سے کم نہ تھا۔ فیض اپنے لیے سوٹ بنوانے کے لیے امرتسر گئے اور رات گئے لاہور واپس آئے ان دنوں ہم نہر کے قریب ایک دور دراز اور الگ تھلگ مکان میں رہتے تھے۔ ٹانگے والے نے فیض کو جس جگہ اُتارا۔ وہاں سے ہمارا گھر ایک میل دور تھا۔ اور انھیں یہ مسافت پیدل طے کرنا پڑی۔ قیمتی بنڈل ان کی بغل میں دبا تھا۔ گھر پہنچ کر فیض نے مجھے جگایا اور میں نے بنڈل اُن سے لے لیا۔ لیکن لیتے ہی میرا ماتھا ٹھنکا بنڈل بہت ہلکا تھا۔ بنڈل کا ایک کنارہ کھلا تھا اور کوٹ ندارد۔ پتلون البتہ میرے پاس کئی سال تک رہی۔

یاسر عرفات صاحب: فیض احمد فیض میرے دوست اور جنگِ بیروت میں میرے رفیق تھے - اس دہکتے جہنم میں بھی اُن کے چہرے کی لازوال مسکراہٹ ماند نہیں پڑی اور اُن کی آنکھیں ناقابلِ شکست عزم و یقین سے دمکتی رہیں:

رنگ و خوشبو کے حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

فیض صاحب جیسے بُردبار، متحمل مزاج، اقدار کی پاسداری۔ امن انسانیت، وطن، جمہوریت اور عدل پر یقین رکھنے والے انسان کی زندگی میں ''راولپنڈی سازش کیس''__ تکلیف دہ واقعہ تھا۔ 9 مارچ 1951 کو قید ہوئے اپریل 1955 میں رہا ہوئے:

نثار میں تیری گلیوں پہ اے وطن کے جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے

''راولپنڈی سازش کیس'' نے اُن کی گھریلو زندگی کو متاثر کیا۔ خاص طور پر فیض صاحب کی بیوی ایلس فیض صاحبہ نے جس حوصلہ، برداشت، استقامت کے ساتھ بچوں کی پڑھائی اور گھریلو ذمہ داریوں کو ملازمت کر کے پورا کیا وہ ایک بیوی اور ماں کا مثالی کردار تھا جس پر جتنی بھی تحسین کی جائے کم ہے۔

رسالہ ''عوامی جمہوری فورم'' شمارہ نمبر 45-اکتوبر 2008 میں پروفیسر خواجہ مسعود صاحب کا انٹرویو چھپا تھا۔ یہ انٹرویو رسالہ کے ایڈیٹر عامر ریاض صاحب نے لیا ہے۔ یہ رسالہ ترقی پسند تحریک اور کمیونسٹ پارٹی کے لیڈران کی کارکردگی پر تحقیقی اور عینی شاہد شخصیات کے انٹرویو کے ذریعہ تاریخ مرتب کر رہا ہے۔ پروفیسر خواجہ مسعود صاحب (سنِ پیدائش 1923) جن کے دادا الف دین صاحب اپنے وقت کے وکیل تھے۔ اور راولپنڈی بار کے پہلے تین بانیوں میں شامل تھے۔ ترقی پسند تحریک کے بانیوں کمیونسٹ پارٹی کے بڑے لیڈروں میں اور فیض صاحب کے دوستوں میں شامل تھے اور جو ذاتی اور خاندانی پس منظر کی وجہ سے بھی ایک بارسوخ لیڈر تھے وہ ''پنڈی سازش کیس'' کو درست قرار دیتے ہیں اور تائید کرتے ہیں کہ فیض صاحب اور سجاد ظہیر صاحب ملٹری افسران کے ساتھ ان سازش کے منصوبے میں شریک تھے۔ عینی شاہد کے طور پر پروفیسر صاحب نے یہ بات کی ہے۔ بہتر ہے کہ پروفیسر خواجہ مسعود صاحب کے انٹرویو کا یہ حصہ پڑھ لیا جائے (صفحہ 26)

عامر: آپ کیا کہیں گے پنڈی سازش کیس میں پارٹی ملوث تھی یا نہیں؟

خواجہ مسعود: ''اس میں کوئی شک نہیں کہ پارٹی اس مسئلہ پر ملوث تھی۔ مجھے یاد ہے ایک دن سبطِ حسن گارڈن کالج آئے اور کہا وکٹوریہ سٹیچو پر شام 7 بجے آ جانا۔ میں چلا آیا۔ انھوں نے کہا میرے پیچھے پیچھے آتے جاؤ۔ وہ مری روڈ پر ایک کرنل کے گھر پہنچ گئے وہ بھی بعد میں پکڑا گیا تھا۔ وہ کمشنر کے گھر کے سامنے رہتا تھا۔ مجھے انھوں نے اندر جانے کا کہا اور خود کہیں آگے چلے گئے۔ میں اندر گھسا تو دیکھا وہاں فیض صاحب بیٹھے تھے۔ سجاد ظہیر بھی موجود تھے۔ نیچے فوجی بھی بیٹھے تھے وہ کھروڑے کھا رہے تھے۔ فیض صاحب نے کہا ہم سات دن بعد دوبارہ آئیں گے تو میرے ٹھہرنے کا انتظام کر دینا۔ سجاد ظہیر صاحب نے کہا کہ میرے ٹھہرنے کا انتظام بھی کرنا ہے۔ میں نے کہا ہو جائے گا۔ میں نے پوچھا یہ کیا ہو رہا

ہے؟ تو غالباً سجاد ظہیر یا فیض صاحب نے جواب دیا کہ ہم تختہ الٹانے کی تیاری کر رہے ہیں۔ میں نے کہا وہ کیسے؟ تو جواب میں انھوں نے بتایا کہ ہمارے ساتھ فلاں فلاں لوگ بھی ہیں۔ میں نے کہا پھر تو معاملہ ٹھیک ہی نظر آتا ہے یہ کہہ کر میں چلا آیا مگر پھر سب کچھ الٹا ہی ہوا۔''

پروفیسر خواجہ مسعود صاحب کے اس انکشاف کے بعد دانشوروں، تاریخ کے اساتذہ، تجزیہ نگاروں، کمیونسٹ پارٹی کے سینئر لیڈروں اور فیض لور کے لیے یہ موضوع نئے سرے سے تحقیق اور بحث طلب ہو گیا ہے؟

لاؤ تو قتل نامہ میرا میں بھی دیکھ لوں
کس کس کی مہر ہے سرِ محضر لگی ہوئی

.....

فیض صاحب دمہ کے مریض تھے۔ 18 نومبر 1984 کی رات کو شدید اٹیک ہوا۔ میو ہسپتال میں داخل ہوئے 20 نومبر 1984 منگل کے روز دوپہر ایک بجکر پندرہ منٹ پر فوت ہو گئے۔ ماڈل ٹاؤن لاہور میں دفنایا گیا۔ جناب فیض صاحب کی وفات پر بھی ایک پروقار منظر تھا۔ جنازے میں محنت کش، ٹریڈ یونیسٹ، شاعر، ادیب، دانشور، کالم نگار، بیورو کریٹ، جج، غیر ملکی سفیر، وکیل، حاکمِ وقت کے نمائندے اور فیض صاحب سے محبت کرنے والوں کا اک ہجوم تھا۔ فیض صاحب کی میت والی چارپائی کو پکڑے اُستاد دامن اشکبار تھے۔ گھر سے جنازگاہ تک لوگوں کا ہجوم بڑھتا رہا (عام طور پر قبرستان پہنچنے تک لوگ آدھے بھی نہیں رہتے)

فیض صاحب کی وفات کے بعد اُن کے لواحقین نے فیض صاحب کی سالگرہ کو ''فیض امن میلہ'' کا نام دیا۔ جو ہر سال بڑی شان و شوکت سے منایا جاتا رہا۔

''فیض امن میلہ'' کی پہلی دو نشستیں لارنس گارڈن اوپن ایئر تھیٹر میں ہوئیں۔ دوپہر کے پروگرام میں فنکار، لوک فنکار ساز و آواز کے ساتھ فیض صاحب کا کلام پیش کرتے جو اپنی ترنگ، اُمنگ اور مستی سے لبریز ہوتا، جس میں منو بھائی جیسے سنجیدہ کالم نگار بھی عارف لوہار کے چمٹے کی تال پر رقصاں ہو جاتے یہ اک کلچر پروگرام ہوتا۔

رات کے پروگرام میں مشاعرہ۔ پہلے میں ہندوستان کے کیفی اعظمی صاحب اور مجروح سلطان پوری صاحب بھی آئے۔ لاہور کی تاریخ میں جو چند قابلِ ذکر مشاعرے ہیں یہ مشاعرہ بھی یقیناً ان میں سے ایک تھا۔ ان پروگراموں میں اتنے لوگ آتے اور فیملی کے ساتھ آتے کہ کھڑے ہونے کے لیے بھی جگہ نہ تھی۔ دوسرے روز کا پروگرام۔ یعنی ''فیض امن میلہ'' کا دوسرا حصہ الحمرا ہال نمبر 1 میں ہوتا جس میں سکالر، دانشور فیض صاحب پر مضمون پڑھتے۔ فیض ایوارڈ دیا

جاتا۔ ملک کے مایہ ناز گلوکار فیض صاحب کا کلام سناتے۔ پہلے سال کے پروگرام میں ملکہ ترنم نور جہاں صاحبہ بیمار ہونے کے باوجود فیض صاحب سے اپنی عقیدت کے اظہار کے لیے آئیں اور فیض صاحب کی غزلیں گائیں۔ گلوکار شوکت علی صاحب نور جہاں صاحبہ کی خرابی صحت کی وجہ سے پانی کا گلاس لیے پاس کھڑے رہے۔

اقبال بانو، فریدہ خانم صاحبہ نے بھی اپنی آواز فیض صاحب کے نام کی۔ ٹینا ثانی صاحبہ نے فیض صاحب کی نظمیں سنا کر بے پناہ داد لی۔

ایک سال پروگرام میں کتھک کی اُستاد رقاصہ ناہید صدیقی صاحب نے فیض صاحب کی نظموں کے پس منظر میں اپنے رقص کو پردے پر پیش کیا۔

الحمرا کی تقریبات باوقار، روح پرور، علم و ادب کی اساس پر مشتمل ہوتی۔ اس ''امن فیض میلہ'' کا انتظار اِک تہوار کی طرح سال بھر کیا جاتا۔ ادب فن، منصب کے حوالے سے ایک سے بڑھ کر ایک بڑی شخصیت ان تقریبات میں شرکت کرتی۔

''فیض امن میلہ'' کی اک تقریب میں ہندوستان کے سابق وزیر اعظم جناب گجرال صاحب سے اپنی یادوں کو تازہ کرنے آئے مگر عملاً یہ تقریبات بالکل عوامی ہوتیں۔

''فیض امن میلہ'' کی اک قابل ذکر تقریب پروفیسر کرار حسین صاحب کا طویل لیکچر تھا۔ جناب پروفیس کرار حسین صاحب کا حسن بیان لہجہ کی کھنک و خوبصورتی ۔ لفظوں کی بندش معنی کی بلاغت وفصاحت نے ہال میں بیٹھے سب لوگوں کو اپنے سحر میں لے لیا تھا۔ عام طور پر مضمون یا لمبی بات پر لوگ اُکتاہٹ کا اظہار کرنے لگتے ہیں۔ مگر پروفیسر کرار حسین صاحب کے اس طویل لیکچر کو لوگوں نے اک سرور کی کیفیت میں سُنا۔

دوسری جادو بیان شخصیت جناب مشتاق یوسفی صاحب ہیں جن کے طویل مضمون کو سامع نہ صرف ذوق وشوق سے سنتے ہیں بلکہ مزید کی خواہش کا اظہار کرتے ہیں:

''فیض امن میلہ'' چند سالوں کے بعد عوام سے نکل کر خواص کا شوق بن گیا۔ یعنی_

جم خانہ کلب کلاس۔

مخصوص تعداد۔ فورسٹار، ڈنر۔ شرکت فیس وغیرہ۔

مگر میرا یقین ہے کہ جب تک کلام فیض موجود ہے ادب کے قاری کا فیض صاحب سے تعلق ہمیشہ اُستوار رہے گا۔

تمھاری یاد سے دل ہم کلام رہتا ہے

☆☆☆☆☆

بیٹی

16 اگست 2015 کو میری بیٹی ماہین نے بہاولپور کے ایک نجی ہسپتال میں آنکھ کھولی۔ بلاشبہ میری زندگی کا وہ حسین دن تھا، میں نے سچے دل سے دعا کی تھی کہ میری پہلی اولاد بیٹی ہو اور جب ماہین پیدا ہوئی مجھے وہ لمحات یاد ہیں کہ اُس کی چھوٹی چھوٹی آنکھیں نئی دنیا کو دیکھ رہی تھیں، ہلکا ہلکا چندھیاتے ہوئے وہ اپنی نظریں اِدھر اُدھر پھیر رہی تھی اور میں اُسے اپنے دونوں ہاتھوں میں اٹھائے ایک عجیب قسم کا لطف محسوس کر رہا تھا۔ ماہین زندگی کی سیڑھیاں آہستہ آہستہ چڑھ رہی ہے، ہر نئے دن کے ساتھ مجھے زندگی کا خوبصورت احساس دلاتی ہے، دوسرے سال سے ہی ماہین نے مٹی کھانا شروع کر دی، یہ جب بھی مظفر گڑھ کے نواحی گاؤں یونین کونسل گانگا میں اپنے دادا ابو کے گھر جاتی یا بہاولپور میں اپنے نانا ابو کے گھر جاتی تو ہم دونوں میاں بیوی سے چھپ چھپا کر مٹی کھاتی، پہلے تو میں نے بڑے لاڈ پیار سے سمجھایا مگر ایک دن پیار کے جذبات سے مغلوب ہو کر غصے میں ایک دو تھپڑ رسید کیے، جس کے سبب وہ رونا شروع ہو گئی اور آنِ واحد میں میری حالت خراب ہو گئی اور مجھے سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ میں اُسے کیسے چپ کراؤں۔ ماہین پھر بھی مٹی کھاتی رہی، جب بھی موقع ملتا وہ مٹی پہ ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیتی، ایک دن جب وہ مٹی کھا رہی تھی میں نے مارنے کے بجائے ماہین کو پکڑ کر سینے سے لگا لیا اور وہ مسلسل ڈر رہی تھی۔ مجھے وہ الفاظ یاد ہیں جب وہ بار بار کہہ رہی تھی۔

'چھوڑ دو بابا مجھے چھوڑ، جانے دو مجھے'۔ وہ ڈر کے جذبے کے تحت مجھ سے دور جانا چاہ رہی تھی۔

مگر میں نے اُسے سینے سے لگائے رکھا اور جب وہ قدرے نارمل ہوئی تو میں نے اُسے اپنی ماں کے پاس جانے دیا۔ کچھ دیر بعد جب میں اپنی سالیوں کے ساتھ باتیں کر رہا تھا ماہین چپ چاپ میرے پاس آئی اور میری گالوں کو اپنے چھوٹے چھوٹے ہاتھوں میں لے کر کہنے لگی۔ 'بابا آپ بہت اچھے ہیں'۔ بیٹی کے وہ الفاظ رہ رہ کر میرے کانوں

جام سجاد حسین

میں ابھی تک گونجتے ہیں۔اب وہ آہستہ آہستہ بڑی ہوتی جارہی ہے، اب جذبات کے ساتھ اُس میں منطقی انداز میں بات کرنے کا ڈھب اُبھرنے لگا ہے، مثلاً آج تک ماہین سے کسی بھی پھل کو ہاتھ نہیں لگایا، پھلوں کے نام سے وہ چڑنے لگتی ہے، کئی بار کوشش کے باوجود وہ کسی بھی پھل کو کھانے سے گریز کرتی ہے، ایک بار زبردستی کھلانے پر اُسے اُلٹیاں آنا شروع ہوگئیں، بعد ازاں اُسی بات کو لے کر وہ ہمیشہ کہتی کہ 'بابا! آپ نے زبردستی پھل کھلایا تو دیکھا مجھے Vomitting ہوگئی تھی'۔ کئی دنوں بعد اُسے کہا کہ چلو آئندہ میں تمھاری ہر بات مانوں گا مگر میری ایک شرط ہے، وہ کہنے لگی۔ 'بتائیں'۔ میں نے کہا کہ اگر پھل نہیں کھانا تو جوس تم پیا کرو۔ شاید اُسے کھلونے لینے کی جلدی تھی تو جھٹ سے ہاں بول دیا، اور میں خاموش ہوگیا اور دل ہی دل میں خوش بھی ہوگیا کہ چلو کوئی بات تو مانی۔ چند لمحے اپنی 'ہاں' پہ غور کرنے کے بعد وہ بولی۔ 'بابا! پھر میری بھی ایک شرط ہے'۔ میں نے جلدی سے پوچھا، ہاں ہاں بتاؤ۔ تو کہنے لگی۔ 'وہ جوس نہیں پیوں گی جس کا فروٹ (پھل) مجھے پسند نہیں ہے'۔ یعنی اگلے ہی لمحے مجھے خاموش کرادیا۔ میں نے کئی بار سوچا ہے کہ بیٹی زندگی کا کس قدر حسین تحفہ ہے، کسی بھی انسان کی زندگی کا مکمل جزو شاید بیٹی ہی ہو کیونکہ آدمی کو بیٹی میں اپنا پن نظر آتا ہے، بیٹی کے وجود میں فطرت نے احساس کا وہ مادہ رکھا ہے کہ وہ بچپن سے جوانی اور جوانی سے بڑھاپے تک والدین کو قدرت کا حسین تحفہ مانتی ہے۔ مشرقی معاشروں میں بیٹی کا وجود گھرانے میں نعمت اور مذہبی نقطۂ نظر سے بیٹی کو رحمت مانا گیا ہے۔ اگرچہ نعمت کا لفظ بیٹے کے لئے زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ مشرقی معاشروں میں بیٹی کو عورت کے اُس روپ سے تشبیہ دی گئی ہے جس کے وجود سے گھرانا چلتا ہے۔ پاکستان کے مسلمان معاشرے میں بیٹی کو لاڈ پیار سے پالا جاتا ہے، اُسے پہلے دن سے ہی بیٹی کا روپ دے دیا جاتا ہے، اُس کی پرورش پرایا دھن مان کر کی جاتی ہے، گویا اُس کے معصوم بچپن سے ہی پرایا مان لیا جاتا ہے، ہر گھر میں بیٹی کو پرایا 'مال' بھی کہا جاتا ہے، یعنی اُسے بڑا کرنے کے بعد اُسے کسی دوسرے گھر میں بیاہ دیا جائے گا، یوں جوں جوں وہ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتی جاتی ہے، وہ اپنے آبائی گھر میں پرائی تصور ہونے لگتی ہے، ماں بیٹی کی مانگ بناتے ہوئے بھی اُسے ایسی نصیحتیں کرتی ہے اور ذہنی طور پر اُسے تیار کیا جاتا ہے کہ کل جب وہ جوان ہوگی تو اُسے دوسرے گھر میں بیاہ دیا جائے گا جہاں اُس نے آبائی ماحول میں کی جانے والی نصیحتوں کے مطابق زندگی گزارنی ہے اور اپنے والدین اور بھائیوں کی غیرت کی لاج رکھنی ہے۔ میرا

ماننا ہے کہ بیٹی کی یہ تربیت کسی حد تک ثقافتی ماحول کے مطابق کی جاتی ہے، ایسی جھوٹی معاشرتی اقدار پروان چڑھا دی گئی ہیں کہ بیٹے کو آغاز دن سے ہی گھر کا وارث جبکہ بیٹی کو پہلے دن سے ہی پرایا سمجھ کر پالا جاتا ہے جو مذہبی حوالے سے بھی درست یا قابلِ تعریف عمل نہیں ہے، اگرچہ مختلف مذہبی معاشروں میں بھی بیٹی کی تربیت کلچر اور معاشرتی اقدار کو سامنے رکھ کر کی جاتی ہے مگر خالصتاً اسلامی معاشرے میں بیٹی کی پرورش کا کم از کم یہ طریقہ وضع نہیں کیا گیا کہ اُسے پیدا ہوتے ہی ایک کمزور، جھکاؤ، اپنی بناوٹی کھوکھلی روایات کے بندھن میں پابند کر دیا جائے اور اُس کی ذہنی نشو ونما اور انفرادی زندگی کی سوچ کو اپنی عناد اور جھوٹی روایات میں قید کر دیا جائے۔ اگرچہ یہاں میرا مطمعِ نظر بیٹی کو مذہبی رنگ میں رنگنا نہیں، اگر بہ امرِ مجبوری ایسا کرنا بھی مقصود ہوتا تو بیٹی کا وجود خالص اسلامی معاشرے میں ایک مقدس ہستی کے طور پر لیا گیا ہے۔ مذہبِ اسلام کے پیروکار اس حقیقتِ حال سے واقف ہیں کہ بیٹی کی گھر آمد پر تعظیماً نبیؐ خود اپنی چادر بچھا دیتے اور بیٹی کو اُس پر بیٹھنے کا کہتے۔ بیٹی کا جائیداد میں واضح حق مختص کیا گیا، حقوق کی مکمل نگہداشت کے ساتھ ساتھ اُسے تعلیم، معاشرتی، معاشی اور زندگی کے دیگر شعبوں میں آگے بڑھنے کے مکمل مواقع دیے گئے تاکہ وہ پوری یکسوئی کے ساتھ اپنا انفرادی مقام بنانے میں کم از کم اُتنا حق رکھتی ہو جتنا بیٹے کو دیا گیا ہے مگر پاکستان میں جسے مذہبی حلقہ جات اسلام کا قلعہ گردانتے ہیں وہاں بیٹی کو حقوق میسر نہیں ہیں۔ 22 کروڑ کی آبادی والے ملک میں بیٹیوں کو مختلف ثقافتی جال میں قید کر دیا گیا ہے، سندھ کا کلچر پنجاب سے، پنجاب کا خیبر پختونخوا اور خیبر پختونخوا کا بلوچستان سے الگ ہے، اسی طرح ان چاروں صوبوں میں بیٹیوں کی پرورش سے لے کر ان کی شادی اور حقوق کی فراہمی اور ان کے تحفظ کے الگ الگ معیار قائم ہیں۔ بیٹیوں کو اپنی زندگی اور مستقبل کا فیصلہ کرنے کا حق حاصل نہیں ہے، چاہتے ہوئے بھی بیٹیوں کو اپنے والدین اور خود سے چھوٹے بھائیوں کی مرضی و منشا کے سامنے زندگی دان کرنا پڑتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں بیٹی کو اُس کے جائز حق سے بھی محروم کر دیا جاتا ہے، شادی کے وقت بیٹی کو جہیز کے نام پر کچھ فرنیچر، طلائی زیورات، اور کچھ پیسے دے دیے جاتے ہیں اور جائیداد کے قانونی حق سے مکمل طور پر محروم کر دیا جاتا ہے، یوں وہ بیٹی جسے بچپن میں لاڈ پیار سے پالا گیا ہوتا ہے وہ جوانی کی دہلیز پار کرنے اور 'پرائے گھر' میں جانے کے بعد اپنے والدین کے گھر میں رچی محبت اور حق سے محروم ہو جاتی ہے۔ اکثر اوقات دیکھا گیا ہے کہ شادی کے بعد بیٹی کی آمد گھر میں محض والدین کی زندگی تک

محدود ہو جاتی ہے جوں ہی والدین آخری سانس لیتے ہیں بیٹی کا داخلہ آبائی گھر میں تقریباً نہ ہونے کے برابر رہ جاتا ہے، بھائیوں کی بے حسی اور بھابھیوں کے طعنوں کے سبب بیٹیاں اپنے آبائی گھر کو بھول کر مجبوراً اپنے گھروں کی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اگر فطرت نے روح میں احساس کا واقعی جذبہ رکھا ہے تو والدین کی روح بیٹی کی حالتِ زار پر یقیناً تڑپتی ہوگی اگرچہ بیٹی کی اس حالتِ زار کا موجب کسی حد تک وہ والدین بھی ہوتے ہیں جنہوں نے بیٹوں کے پیار میں بیٹیوں کو ان کے جائز حق سے محروم رکھا اور ان کی پرورش اس انداز میں کی کہ وہ اپنا جائز حق مانگنے میں بھی آزاد نہ ہو سکیں بلکہ معاشرتی قید و بند میں جکڑ کر رہ گئیں۔

ہمارے معاشرتی معاشروں میں بیٹی اپنا جائیداد کا حق مانگنے میں نہ صرف شرم محسوس کرتی ہے بلکہ حق مانگنے کے رویے کو شرمساری اور ہیچ تصور کیا جاتا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ اگر بیٹی کی صحیح معنوں میں تربیت کی جائے، اُسے سیاسی، معاشی، معاشرتی اور ثقافتی تقاضوں کے مطابق زندگی میں آگے بڑھنے کا موقع فراہم کیا جائے تو وہ سابق وزیراعظم پاکستان محترمہ بے نظیر بھٹو کے روپ میں ملک کی وزیراعظم، سابق سپیکر قومی اسمبلی ڈاکٹر فہمیدہ مرزا، موجودہ اپوزیشن لیڈر سینٹ شیری رحمان، سابق ڈپٹی سپیکر سندھ اسمبلی شہلا رضا، موجودہ وفاقی وزیر محکمہ موسمیات زرتاج گل، وفاقی وزیر انسانی حقوق و ہیومن رائٹس ڈاکٹر شیریں مزاری، سابق ڈائریکٹر جنرل تعلقات عامہ پنجاب نبیلہ غضنفر خان اور دیگر کئی خواتین کی طرح زندگی کے تمام شعبہ جات میں گراں قدر خدمات سرانجام دے سکتی ہے، برطانیہ میں سابق وزیراعظم مارگریٹ تھیچر، تھریسا مے، سابق امریکی سیکرٹری آف سٹیٹ، زوجہ سابق امریکی صدر بل کلنٹن اور سابق صدارتی اُمیدوار ہیلری روڈھم کلنٹن، جرمن چانسلر انجیلا مرکل، سابق آسٹریلوی وزیراعظم جولیا ایلین گیلارڈ، سابق وزیراعظم نیوزی لینڈ جینی شپلے اور موجودہ خاتون وزیراعظم جینڈا آرڈین، ملینڈا گیٹس، انٹرنیشنل مانیٹری فنڈ (آئی ایم ایف) کی مینیجنگ ڈائریکٹر کرسٹین لاگارڈ، جنرل موٹرز کی چیف ایگزیکٹو آفیسر میری بارا، صدر فیڈلٹی انویسٹمنٹ آبیگائی جانسن، یوٹیوب کی چیف ایگزیکٹو آفیسر سوسان ووجیکی، آئی بی ایم کی چیف ایگزیکٹو آفیسر گنی رومیٹی اور دیگر ممالک میں گراں قدر خدمات سرانجام دینے والی خواتین کو گھر سے ہی ایسی تربیت فراہم کی گئی کہ انہوں نے خود کو خاتون کے لئے مختص کیے گئے روایتی خول سے باہر نکل زندگی میں آگے بڑھنا سیکھا۔ بیٹی کو جس قدر بنیادی انسانی حقوق، جائیداد اور وراثت کے حقوق، تعلیم اور معاشرتی و معاشی ترقی

کے راستوں میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں گی اس قدر ہی معاشرہ زوال پذیری کی طرف گامزن ہوگا۔ ترقی یافتہ ممالک نے بیٹی کی پرورش اس انداز میں کی ہے کہ وہاں عورت خود کو محفوظ تصور کرتی ہے، معاشرتی اقدار اگرچہ مشرقی معاشروں میں رائج اقدار سے قدرے مختلف ہیں مگر بیٹی کو آگے بڑھنے کے تمام مواقع میسر ہیں۔ بیٹی کو نہ صرف اپنی مرضی کا پیشہ ورانہ شعبہ منتخب کرنے کا حق دیا گیا ہے بلکہ زندگی گزارنے کے لئے ہمسفر چننے کا بھی حق فراہم کیا گیا ہے، عورت کو انفرادی و معاشرتی اور ملکی ترقی میں برابر کا حصہ دار سمجھا گیا ہے۔ میرا ماننا ہے کہ بیٹی کی پرورش اس انداز میں کی جائے کہ جب وہ عورت کے روپ میں ڈھلے تو احساسات سے جذبات تک اور سوچ سے اعمال تک وہ بااختیار ہو، وہ معاشرے میں اپنے سماجی کردار کا تعین کرنے میں آزاد ہو، بیٹی کو اسی انداز میں پروان چڑھایا جائے جس انداز میں بیٹے کی پرورش کی جاتی ہے تاکہ جب وہ جوان ہو تو معاشرے میں رائج اچھائیوں اور برائیوں کے تصور کا عکس پرچھائی کی طرح اُس کے دماغ پر چھایا رہے کہ وہ بااختیار ہو کر زندگی کے راستوں کا خود تعین کرے۔ بیٹی کی ذہنی نشوونما کا پیمانہ بیٹے کی ذہنی نشوونما کے برابر کیا جائے۔ عورت کا معاشرتی کردار براہ راست بیٹی کی کردار سازی سے منسلک ہے۔ اگر بیٹی کو طاقتور بنایا جائے گا تو معاشرے میں عورت خود بخود طاقتور ہو کر اُبھرے گی۔

دوسرا اہم پہلو سماجی و معاشرتی رویوں کا جائزہ لینا ہے۔ مشرقی معاشروں میں سماجی رویہ قدرے پیچیدہ ہیں۔ ہر ملک کے معاشرے کا سماجی رویہ دوسرے ملک کے معاشرتی و سماجی رویے سے مختلف ہے۔ سکول جانے والی لڑکی سے لے کر یونیورسٹی جانے والی لڑکی کو مختلف سماجی رویوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان تمام رویوں کا تعلق ہماری زندگی میں اہم کردار ادا کرنے والی ذات 'مرد' سے ہے۔ مرد کو چونکہ معاشرتی و سماجی برتری حاصل ہے اس لیے تعلیمی اداروں سے لے کر قانون ساز اداروں تک مرد کا کردار عورت کے لئے مشکلات کا باعث بن رہا ہے۔ اگرچہ پاکستان میں عورت کے معاشرتی و سماجی کردار کے تعین کے لئے عورت کے حقوق اور حفاظت کی غرض سے مختلف محکمہ جات قائم کیے گئے ہیں جو عورت کی تعلیم، کام کی جگہ پر حفاظت، حقوق کی بحالی اور دوسری سہولیات فراہم کرنے کیلئے کوشاں ہیں مگر تا حال عورت کا سماجی کردار مرد کے برابر نہیں لایا جا سکا۔ اس مقصد کے حصول کے لئے لازم ہے کہ معاشرتی قدروں کو ثقافتی ترقی کی روشنی میں دیکھا جائے، معاشرے میں رائج ثقافت اور معاشرتی ترقی کی روشنی میں اقدار کا ازسرِ نو جائزہ لیا جائے کیونکہ ہمارے

معاشرے میں مختلف طبقات نے سماجی اقدار کو مذہب کی آڑ میں اپنی مرضی کے مطابق ڈھالا ہوا ہے۔ مثلاً ایک طبقہ ایسا ہے جو خواتین کی جانب سے چھوٹے چھوٹے اور باریک کپڑے پہننے کو فیشن کا نام دیتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ خواتین کے اس عمل کو مذہب کی روشنی میں فحاشی کا نام دیتا ہے۔ ایک طبقہ عورت کے کپڑوں سے لے کر سماجی اعمال کو عورت کی انفرادی عمل قرار دیتا ہے جبکہ دوسرا طبقہ عورت کے اس عمل کو مذہب کی آڑ میں معاشرے کے لئے بگاڑ کا سبب قرار دیتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں مرد کے اسی طرح کے اعمال کو 'جائز' قرار دیا گیا ہے، مرد چھوٹے اور باریک کپڑے پہنے، کوئی بھی سماجی عمل کرے، کوئی بھی کردار ادا کرے، مرد کے ان تمام انفرادی اعمال کو معاشرے میں جائز مان لیا گیا ہے جبکہ عورت کے لئے معاشرتی و سماجی پابندیاں عائد کر دی گئی ہیں۔ ایک تلخ حقیقت یہ بھی ہے کہ انفرادی سطح پر مرد عورت کے باریک کپڑوں سے لے کر منفی کردار تک کو اپنی ذات کی حد تک جائز تصور کرتا ہے اور ہر دوسرے مرد کے لئے نہ صرف نا جائز بلکہ مذہب کی آڑ لے کر اسے گناہ مانا گیا ہے۔ یوں بیٹی کو بچپن سے لے کر جوانی اور جوانی سے عورت کے روپ تک مختلف امتیازی رویوں، معاشرتی، سماجی اور ثقافتی ڈھانچوں میں قید کر دیا گیا ہے۔ بیٹی کا یوں قید کیا جانا معاشرے میں جمود کا باعث بنا ہے، اس جمود نے کئی معاشرتی برائیوں کو جنم دیا ہے، عورت مذہب، سماج، معاشرہ اور سیاست کے تمام شعبہ جات میں بھرپور انداز میں کردار نبھانے سے قاصر ہے۔ مشرق کی عورت مرد کے بنائے گئے سماجی حدود و قیود میں بند ہے، اگر مذہب کو آخری تصور یا حقیقت مان لیا جائے تو عورت کو اس مذہب کی روشنی میں بھی آزادی اور حقوق مہیا نہیں ہے بلکہ وہ معاشرتی حیوانوں کے خود ساختہ پابندیوں میں جکڑ دی گئی ہے۔ اس لیے مشرقی معاشرے میں سوائے چند عورتوں کے مجموعی طور پر عورت اُبھر کر سامنے نہیں آسکی اور نہ ہی وہ سماجی و انسانی فلاح کے کاموں میں اپنی شناخت بنا سکی ہے۔ ان چند عورتوں کی زندگیوں کا عمیق مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی مغربی ثقافتی معاشروں کی تعلیم یافتہ ہیں اس لیے وہ مشرقی معاشرے کی اقدار کو ٹھکراتے ہوئے آگے بڑھ سکی ہیں۔

میں نے عورت کے کردار کا عمیق جائزہ لینے کے بعد سوچا ہے کہ اگر فطرت نے میری زندگی کی لگام کو ڈھیل دیے رکھی تو میں اپنی بیٹی ماہین کو ایک طاقتور عورت کا روپ دوں گا یا کم از کم جبر کی خود ساختہ معاشرتی پابندیوں سے بالا کر اُس کی مدد کرنے کی پوری کوشش کروں گا تاکہ وہ مذہب، سماج، ثقافت اور سیاست میں اپنی انفرادی مقام بنانے کے قابل ہو سکے اور دوسری عورتوں کی زندگیوں میں آسانی پیدا کرنے کا ذریعہ بن سکے۔

☆☆☆☆☆☆

غزل

آنکھ کب جھپکے گی ، بکھرے گی یہ زنجیر کہاں
اے مرے خواب رواں ! ہے تری تعبیر کہاں

کون جانے کہ اُٹھا تھا یہ دُھواں کس گھر سے
کون جانے کہ ترازو ہیں ترے تیر کہاں

رنگ کس رنگ کے ڈھونڈوں کہ تجھے دیکھ سکوں
گونج اے گونج ! لکیروں تری تصویر کہاں

کون اُٹھائے گا ترے بعد تھکن کی گٹھڑی
رُک کے چن لیں مجھے رہگیر ، یہ تقدیر کہاں

برق رو راہ برو! لوگ رہے جاتے ہیں
مگر اے راہ گرو ! فرصتِ تاخیر کہاں

زندگی ساتھ رہے گی کہ وہ یہ دیکھ سکے
سانس کب لیتے ہیں، دم دیتے ہیں نخچیر کہاں

وقت مت ٹھیل مری طرح مری دُبدھا میں
خوفِ رسوائی کہاں ، حسرتِ تشہیر کہاں

چارسُو پھیل گئے کانچ کے ٹکڑے خالد
حسنِ مفہوم کہاں ، کاہشِ تفسیر کہاں

خالد احمد

غزل

انجام بہت بُرا ہوا ہے
آغاز جھکائے سر کھڑا ہے

تحریر میں ضد کا شائبہ تھا
مکتوب کسی نے یوں لکھا ہے

اس عشق میں انتہا یہی تھی
دریا میں رواں دواں گھڑا ہے

کیسا یہ رہنما ہے میرا
جذبات کی رو میں بہہ رہا ہے

تبدیل نہیں ہوئی ہے حالت
جب حال گھروں میں ایک سا ہے

لفظوں کے وہ جوڑے ہیرے موتی
جو شخص ہمارا بادشہ ہے

ثاقبؔ بس میں نہیں سماعت
اب کون تجھے پکارتا ہے

آصف ثاقب

غزل

وہ جو رمز تھی وہ کھلی تو ہے بڑی دیر سے ہے مگر کھلی
یہی زندگی کا اصول ہے، بڑی بے اصول ہے زندگی

ہوئی عمر ہم کو جدا ہوئے مگر ایک لمحے کو بے خبر
کبھی ایک دوجے کے حال سے نہ تو میں رہا نہ تو وہ رہی

کوئی سُن کے کان لپیٹ لے، وہ بُری لگے کہ بھلی لگے
یہ جو اجتماعی ضمیر ہے وہ تو سب کہے گا کھری کھری

سرِ بزم سب کو یقین تھا وہ تھے صرف اُس کے ہی واسطے
وہ جو ایک پَل کا گریز تھا وہ جو اک نگاہ تھی سرسری

یہاں کون کس کا ہے ہم سفر! جو ہے اِرد گرد اُسے بھول کر
کبھی رُک گئی کبھی چل پڑی کسی ریل جیسی ہے زندگی

کیوں نہ بخت پر اُسے ناز ہو دلِ آدمی ہے وہ آئینہ
کہ ہے چشمِ لطف سے دیکھتا جسے خود خدا بھی کبھی کبھی

کسی راہ میں کسی موڑ پر میں رکا نہیں میں تھکا نہیں
ترے خواب تھے مرے ہم سفر، مری راہبر تری یاد تھی

سرِ عام رکھتے ہیں کھول کر جو بھی واقعے تھے چھپے ہوئے
نہیں وقت سا کوئی صاف گو، بڑی بدلحاظ ہے ہسٹری

ہے قدم قدم پہ نیا جہاں، ہیں نفس نفس نئے مرحلے
اُسی بے نیاز کو چھوڑ کر نہیں کچھ کہیں پہ بھی آخری

یہ عجیب سا کوئی راز ہے نہ ہے منکشف، نہ چھپا ہوا
کہیں تیرگی میں ہے روشنی، کہیں روشنی میں ہے تیرگی

امجد اسلام امجد

غزل

تیری محفل پہ بُرا وقت جو آیا ہوا ہے
آپ ہی دیکھ کہاں کس کو بٹھایا ہوا ہے

ناگہاں آگ جل اٹھتی ہے کسی کونے سے
کوئی آسیب در و بام پہ چھایا ہوا ہے

نئی تعمیر کے آثار تو دیکھے نہ کہیں
شہر کا شہر مگر آپ نے ڈھایا ہوا ہے

ہم کہ اک عمر چراتے رہے آنکھیں جن سے
اُن سوالات نے اب حشر مچایا ہوا ہے

دشمنوں کی کسی سازش کا نہیں دخل اِس میں
یہ جو ادبار ہے اپنا ہی کمایا ہوا ہے

کھیل سے ہی نہ کہیں تم کو نکلنا پڑ جائے
اتنا کردار کرو جتنا بتایا ہوا ہے

فرش کر رکھی ہیں کب سے تری رہ میں آنکھیں
اور دل کو سرِ دہلیز بچھایا ہوا ہے

ٹوٹتی ہی نہیں اک راہ نکلنے کی رجا
دل وہ عالی درِ توفیق سے پایا ہوا ہے

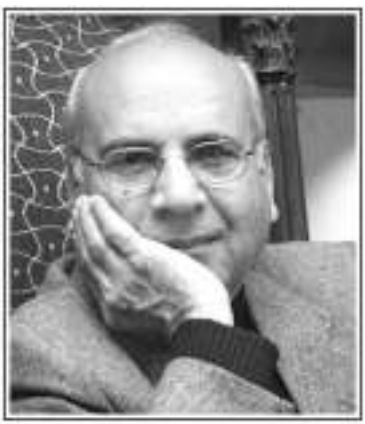

جلیل عالی

غزل

اک اک ابرو اشارہ تیر ہوتا جا رہا ہے
لب و لہجہ ترا شمشیر ہوتا جا رہا ہے

وہ نکلا تھا جسے اپنی نگہ کا صید کرنے
خود اُس کے حسن کا نخچیر ہوتا جا رہا ہے

بدن کے زخم تو اعزاز کر لیتا ہوں لیکن
مرا پندار بے توقیر ہوتا جا رہا ہے

مرے سامان میں رکھا گیا اک خوف سایا
مری رفتار کو زنجیر ہوتا جا رہا ہے

گرفتِ داستاں گو میں نہیں رہنی کہانی
کہ اب قصہ بہت گمبھیر ہوتا جا رہا ہے

کتابوں میں بھلے جیسی بھی تم تاریخ لکھو
دلوں پر وقت خود تحریر ہوتا جا رہا ہے

انائیں اس قدر مجہول ہوتی جا رہی ہیں
سخن کا مبتدی بھی میر ہوتا جا رہا ہے

دلوں کی سرزمیں تک آ گئی یلغارِ دہشت
یہ خطہ وادیِ کشمیر ہوتا جا رہا ہے

جلیل عالی

غزل

کیا ہوں زندہ یہ سوچتا ہوں میں
سر ہے تکیے پہ جاگتا ہوں میں

اپنی صورت ہی اب نظر آئے
آئینے میں تو دیکھتا ہوں میں

رات بستر پہ جاگرا لیکن
نیند میں جیسے چل رہا ہوں میں

غیر سمجھا ہوں دیکھ کر خود کو
اب تو خود سے بھی بھاگتا ہوں میں

کس نے بہتان مجھ پہ باندھا ہے
کب بھلا خود کو چاہتا ہوں میں

میرے اندر چھپا رہا برسوں
اپنے دشمن کو جانتا ہوں میں

جو بھی رکھا تھا لٹ گیا آخر
گھر میں کیا ڈھونڈتا رہا ہوں میں

کون لایا، کہاں سے آیا ہوں
جانے کس کس سے پوچھتا ہوں میں

مجھ کو مانگا یہاں حسنؔ کس نے
گویا کہنے کو اک دعا ہوں میں

حسن عسکری کاظمی

غزل

اَے سبھوں کے خُدا، مِری سُن تو !
شک میں ڈوبا مِرا تیقُّن تو؟

ایک دُنیا نئی بنے شاید !
مَیں نے بھی کہہ دیا اگر 'کُن' تو؟

اپنے شعروں میں سانس لیتا ہوں
لگ گیا اِس ہُنر کو جب گُھن تو؟

ٹھوکریں مار مت زمین پہ یوں
تیرا بگڑا کہیں توازُن تو؟

ماننا بعد کی ہے بات، مگر
کہہ رہا ہوں جو، غور سے سُن تو !

بے حِسی مجھ پہ حملہ آور ہے
جِسم میرا جو ہو گیا سُن تو ؟

جھانک کر دیکھ میرے دِل میں کبھی
گا رہا ہوں ابھی ترے گُن تو

مَیں سہولت سے مر بھی سکتا ہوں
دوست کرتے رہے تعاوُن تو

اپنی کوئی خبر نہیں دیتا!
لے رہا ہے وہ میری سُن گُن تو

شاید اُن میں کوئی صَدَف بھی ہو
سیپیاں ساحلوں سے کچھ چُن تو !

یہی ماحول گر رہے گا نسیم
پھیلتا جائے گا تعفُّن تو!

نسیمِ سحر

غزلیں

موجِ دریا سے ضروری تھا کہ لڑتے رہتے
گلے پڑتے تھے جو گرداب تو پڑتے رہتے

شعر کہنا کوئی آساں نہیں میرے نقاد!
ہم تری طرح سے پنسل نہیں گھڑتے رہتے

ایک دن مان لی اُس کی سو بہت خوار ہُوئے
کام بن جاتے اگر روز بگڑتے رہتے

اور بھی رہتا اگر تن پہ لباسِ ہستی
داغ دھبے مری پوشاک پہ پڑتے رہتے

آدھا آدھا کیا جاگیر کو تب چین ہُوا
کب تلک بھائی سے بیکار جھگڑتے رہتے

خاور اعجاز

بوتے ہیں خواب میں دن، اور رات کاٹتے ہیں
ہم اپنی جاں پہ کیا کیا آفات کاٹتے ہیں

لطفِ سخن ہی اُن سے باقی نہیں رہا اَب
ہم بات جوڑتے ہیں وہ بات کاٹتے ہیں

کیا پوچھتے ہو ہم سے کیا لکھ رہے ہیں، لیکن
اِتنی خبر ہے جس پر یاں ہات کاٹتے ہیں

اے آسماں تجھے کچھ معلوم ہے حقیقت
ہم کس طرح سے اپنے اوقات کاٹتے ہیں

تھم جائے گا بالآخر یہ زورِ گریہ خاورؔ
چلیے اِک اور غم کی برسات کاٹتے ہیں

غزل

گو چمک ہے بہت سی کپڑوں پر
پھر بھی رونق نہیں ہے چہروں پر

جو ہنر تھا یقین کا مظہر
واہموں پر ہے اور قیاسوں پر

وعدہ ان کا تھا روز روشن کا
تان ٹوٹی ہے کالی راتوں پر

احترام اٹھ گیا صحیفوں کا
حرف آنے لگا ہے لفظوں پر

کیسے دن پھر گئے خزاؤں کے
خاک پڑتی گئی بہاروں پر

قہقہوں میں سرور ملتا ہے
کان دھرتا ہے کون آہوں پر

جن میں کشکول ہے گدائی کا
شرم آتی ہے ایسے ہاتھوں پر

کمتریں ہیں جو بیچ دیتے ہیں
من کی آشا کھنکتے سکوں پر

حرمتِ لفظ ہے گراں مایہ
رشک آتا ہے سچے حرفوں پر

منقسم ہو گیا مکاں سارا
وارثوں میں ٹھنی ہے حصوں پر

یہ تماشا ریاض کیسا ہے؟
غصہ آتا ہے ہم کو اپنوں پر

سید ریاض حسین زیدی

غزلیں

وقت اگر مجھ کو تب و تاب دکھانے دیتا
چوکھٹے قبر کے خالی ہی پڑے رہ جاتے

موسمِ ہجر کو خنجر نہ چلانے دیتا
تازہ تصویرِ اجل کو نہ لگانے دیتا

دوریاں ڈالتی ہیں فاصلے انسانوں میں
موت کو روکنا گر بس میں کسی کے ہوتا

ان کو بندوں میں جُدائی نہ بڑھانے دیتا
کون اُسے زندہ وجودوں کو مٹانے دیتا

گو ہواؤں کا ہدف پیڑ ہوئے ہیں کتنے
میں بھی گلزارؔ کمر باندھ کر بیٹھا ہوا ہوں

آندھیوں کو نہ شجر اور گرانے دیتا
ورنہ احباب کو محفل سے نہ جانے دیتا

ٹوٹ سکتی نہ قیامت کبھی مجبوروں پر
جابروں کو نہ کوئی حشر اُٹھانے دیتا

بھیڑیے لُقمہ بنانے کی تگ و دو کرتے
دسترس میں کسی ہرنی کو نہ آنے دیتا

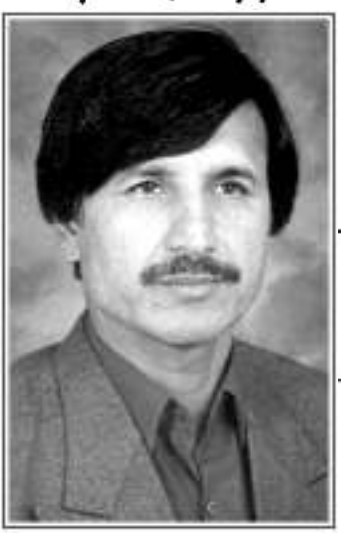

گلزار بخاری

کچھ دن بہار جشن منائے گی تخت پر
تختے سے بچ سکے گا نہ شاطر وجود بھی

آخر خزاں بھی رنگ جمائے گی تخت پر
کب تک اسے حیات بٹھائے گی تخت پر

مشکل ہے زندگی میں اتارے گا سر سے تاج
صدیوں سے خواجگی کے تسلط میں ہے جہاں

لگتا ہے اس کی جان بھی جائے گی تخت پر
کیا بندہ پروری کبھی آئے گی تخت پر

بیزار کر چکا ہے عوام و خواص کو
گلزارؔ خودسری ہے ازل سے تباہ کُن

تائید کس کی پھر اُسے لائے گی تخت پر
ذلت سے عاجزی ہی بچائے گی تخت پر

اس وقت کو بھی ذہن میں رکھے وہ جس گھڑی
قسمت مخالفوں کو دکھائے گی تخت پر

غزل

زخم ۔ دیوار کا نہ در کا خیال
ایسے رکھتے ہیں اپنے گھر کا خیال؟

سب سے پہلے وہی شکار ہوئے
جن پرندوں کو تھا شجر کا خیال

پھر وہی شغل۔ ضبط ۔ آہ ۔ دل
پھر وہی پارۂ جگر کا خیال

دھوپ نکلی تو شام یاد آئی
رات آئی تو ہے سحر کا خیال

عمر بھر ہم نے اس کو یاد کیا
بس یہی ایک عمر بھر کا خیال

اس کی محفل میں اعتبار کہاں
ہر نظر کو ہے ہر نظر کا خیال

شاید آ جائے اس کا خط باقی
روز رکھتا ہوں نامہ بر کا خیال

باقی احمد پوری

غزل

کہانی تو نے جو لکھی فرات! پانی کی
بروزِ حشر نہ ہو گی نجات پانی کی

میں جانتا ہوں ستمگر کی پیاس کا مطلب
لہو میں ڈھونڈ رہا ہے صفات پانی کی

جہاں پہ پیاس ہو، یہ اسطرف نہیں جاتا
عجب لگی ہے مجھے نفسیات پانی کی

کھنڈر کھنڈر میں ہیں کچے گھروں کی تصویریں
کہیں ہوا کی کہیں واردات پانی کی

زمیں نے سرخ رتوں کا نصاب لکھنا تھا
قلم ہوا کا لیا اور دوات پانی کی

یہ سیلِ آب کہاں رک سکے گا مٹی سے
بڑھا رہا ہوں فقط مشکلات پانی کی

دعا کرو کہ پہاڑوں پہ برف گرتی رہے
زمین دیتی رہے گی زکوٰۃ پانی کی

گزر چکا ہے کنور سیلِ آب بستی سے
کہیں کہیں ہیں مگر باقیات پانی کی

اعجاز کنور راجہ

غزل

محوِ حیرت ہیں کہ تعمیر کی حسرت کیا ہے
آسماں ہے تو کسی چھت کی ضرورت کیا ہے

ہم نے رکھے ہیں سرِ شام دیے مٹی میں
ہم سے پوچھے کوئی، مٹی کی محبت کیا ہے

آئنہ ہونے کی خواہش بھی تو خود ہی کی تھی
اب اگر ٹوٹ کے بکھرے ہیں تو حیرت کیا ہے

شاخ سے ٹوٹتے پتے ہی بتا سکتے ہیں
ہجر کیا چیز ہے اور اصل میں ہجرت کیا ہے

ان کے ہم راہ کسی روز نکل چلتے ہیں
دیکھتے ہیں کہ پرندوں کی مسافت کیا ہے

خود ہی مارے گئے ہم خواب کے چوراہے پر
ہم جو یہ دیکھنے نکلے تھے حقیقت کیا ہے

شام کے پہلے ستارے نے ہوا سے پوچھا
ریت پر لکھی ہوئی تیری عبارت کیا ہے

دھیان کے شہر میں اُترا ہُوا صحرا اطہر
پوچھتا پھرتا ہے گلیوں میں، کہ وحشت کیا ہے

ممتاز اطہر

غزل

اے آنکھ بہت لہو نہ ٹپکا
جائے گا کہاں یہ جی کا لپکا

آئینہ کلام کر رہا ہے
اے میرے جنوں! پلک نہ جھپکا

جب عشق رگوں میں تیرتا تھا
کیا زور تھا حشر سوز تپ کا

یوں ہی تو جگر نہ خوں ہوا تھا
دل نے دیا راستہ جھڑپ کا

یوں ہی نہیں کچھ اِدھر اُدھر ہم
رشتہ کوئی راست سے ہے چَپ کا

سینے میں اُتر گیا تھا بھالا
اُس آتشِ جاں تپاں کی تَپ کا

کس خواب نے رات آنکھ بھر دی
منہ پر دیا تیرے غم نے چھپکا

اب راکھ کا ڈھیر ہے کہ دل ہے
ارمان نکل گیا تڑپ کا

خالد! ...خاموش! اور خاموش!
ہے شور ہوا میں دھول دھپ کا

خالد علیم

غزل

دل کے جو بھی غلام رہتے ہیں
موت سے ہم کلام رہتے ہیں

سر بکف راستی کے سب پیکر
ظرف کے زیرِ دام رہتے ہیں

خون پینا ہی جن کی خصلت ہو
عمر بھر تشنہ کام رہتے ہیں

چاہ غم میں کبھی جو اُترا ہوں
ہوش بالائے بام رہتے ہیں

جگ میں زندہ ہیں وہ سدا جن کے
تذکرے صبح و شام رہتے ہیں

رہروانِ جنوں کی راہوں میں
دیپ تو گام گام رہتے ہیں

جو رہیں منسلک مشقت سے
منتظر اُن کے کام رہتے ہیں

دوسروں کے لیے ہیں تعبیریں
خواب سب میرے نام رہتے ہیں

وہ فقیروں سے فیض پاتے ہیں
جو بھی دامن کو تھام رہتے ہیں

جو جنُوں کو نہ آفریں سمجھیں
وہ خرد کے غلام رہتے ہیں

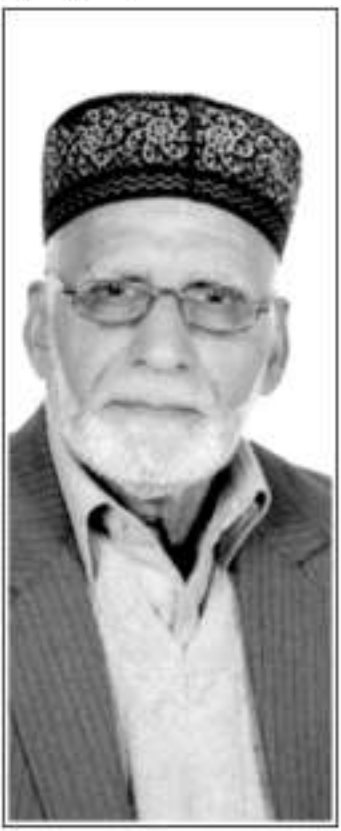

رشید آفرین

غزلیں

حسرت و ناصر و عدم تو نہیں
پھر بھی چرچا ہمارا کم تو نہیں

کوئی مقتل ہو یا کوئی دربار
سر ہمارا کہیں پہ خم تو نہیں

میرے ہاتھوں میں ہے قلم اب تک
ہاتھ میرے ابھی قلم تو نہیں

میں قلم کو زباں سمجھتا ہوں
ہاتھ میرے ابھی قلم تو نہیں

اے مسافر ترے مقدر میں
جامِ حسرت ہے جامِ جم تو نہیں

دفترِ دہر پڑھ کے دیکھ لیا
تم ہی تم ہو کہیں پہ ہم تو نہیں

ہے کرامت غزل میں اور بھی کچھ
صرف لہجے کا زیر و بم تو نہیں

کرامت بخاری

دل مضطرب ہے اور کوئی اضطراب ہے
خانہ خراب خواب کا عالم بھی خواب ہے

تاخیر کی تپش سے توانا ہوا ہے دل
تعجیل کے سفر کا یہ تازہ نصاب ہے

لہجے میں ہے لہو کا بھی کچھ ذائقہ جناب
یہ خون سے خطاب کی خواہش کا باب ہے

رو رو کے میں نے لفظ لکھے لوحِ زیست پر
شیون کا شور شعر کا اصلی شباب ہے

مٹی میں جو مہک ہے وہ اعلیٰ نسب سے ہے
یعنی ابوتراب سے عزت مآل ہے

اشکِ رواں کی رسم کرامت سے کم نہیں
یہ آنکھ آب آب ہے اور باریاب ہے

غزل

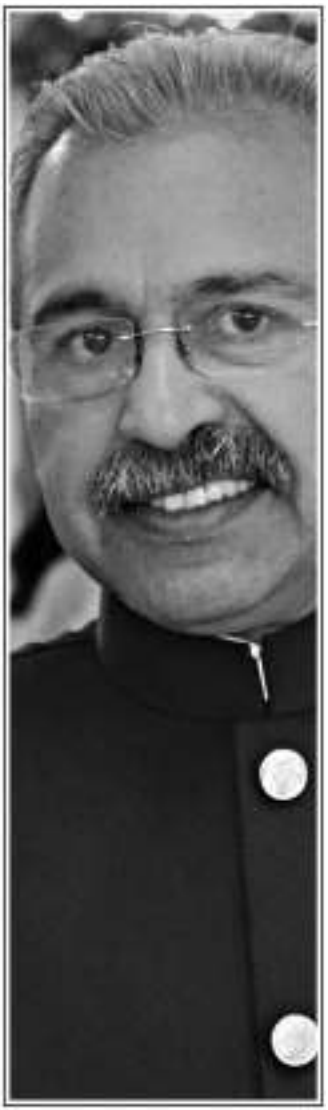

آئنہ دل اور ستارہ ٹوٹ کر
جڑ نہیں سکتا دوبارہ ٹوٹ کر

آج بھی ہے آنکھ میں اُس کی خلش
چبھ گیا تھا اک نظارہ ٹوٹ کر

اُس کے قدموں میں بکھرنے کے لیے
پھول کرتے ہیں اشارہ ٹوٹ کر

زندگی کیا ہے بڑی آسانی سے
کہہ گیا مجھ کو ستارہ ٹوٹ کر

جا لگا چُپ چاپ دریا کے گلے
ایک دن آخر کنارہ ٹوٹ کر

تم کو ثابت دیکھ کر حیرت ہوئی
جس جگہ پر ہے گزارہ ٹُوٹ کر

ہاتھ کب آتا ہے راحت سرحدی
تار سے گیسی غبارہ ٹوٹ کر

راحت سرحدی

غزل

چمکتی یاد، گئی رات کی، پڑی ہوئی ہے
اُداس صحن میں کچھ چاندنی پڑی ہوئی ہے

جو چاہیے جسے لے جائے راستے کے لیے
یہاں اندھیرا، وہاں روشنی پڑی ہوئی ہے

ٹھہر تو جاؤں سرِ مرگ دو گھڑی میں بھی
مگر جو پیچھے مرے زندگی پڑی ہوئی ہے!

نہ مسکراؤ، چلو دھوپ کی دعا دے دو
بہت دنوں سے اِدھر رات سی پڑی ہوئی ہے

ابھی ابھی کوئی شاید اُٹھا ہے پڑھتے ہوئے
کتابِ رفتہ کہ حامدؔ کھلی پڑی ہوئی ہے

حامد یزدانی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دھوپ کی، ریت کی، تنہائی کی، ویرانی کی
ہم نے اک عمر ترے غم کی نگہبانی کی

غزل

بے سایہ دیوار بنا دی
جب بھی ہوئی مسمار، بنا دی

میرے دل کے دروازے پر
دستک بھی جھنکار بنا دی

اُس نے ہاتھ میں ہاتھ لیا تھا
دو دھاری تلوار بنا دی

آگ کو آگ دکھائی اُس نے
چنگاری گلنار بنا دی

اُس کی تیز نگاہی ، توبہ
نور کی جو رفتار بنا دی

پلکوں سے دیوار بنا کر
زلفوں سے پھر دار بنا دی

دھوپ گزیدہ اصغرؔ نے اک
بے سایہ دیوار بنا دی

علی اصغر عباس

غزلیں

ہٹا کے راہ کے سنگِ گراں چلے آؤ
مثالِ تشنۂ آبِ رواں چلے آؤ

زمانہ بیت گیا مجھ کو مسکرائے ہوئے
وہ اپنے ساتھ لیے شوخیاں چلے آؤ

میں جی بھی سکتا ہوں تم بن میں ہنس بھی سکتا ہوں
بہت غلط تھا یہ میرا بیاں چلے آؤ

میں سوچتا ہوں بایں عمر ساتھ لازم ہے
جو رہ گئی ہے نہ ہو رائیگاں چلے آؤ

بغیر آپ کے یہ گھر مرا نہیں لگتا
سو ہو گیا ہوں میں بے خانماں چلے آؤ

منظور ثاقب

وہ جو اک خندہ جبیں دل میں مکیں رہتا ہے
بات پر میری مگر چیں بہ جبیں رہتا ہے

نسبتِ خاک کی توقیر ہے اس کے دل میں
آسماں چھو کے بھی جو خاک نشیں رہتا ہے

کاوشِ تازہ و پیہم ہو میسر جس کو
خواب، تعبیر کے بالفعل قریں رہتا ہے

اپنے آئینے کو میں گھر کی طرح لیتا ہوں
آنا جانا مرا یونہی تو نہیں رہتا ہے

کچھ نہ کچھ اپنا اثر رکھتی ہے صحبت آخر
وہ جو رہتا ہے حسینوں میں حسیں رہتا ہے

عمر ہی کی تو نہیں کوئی عنایت ثاقبؔ
بات بے بات جو دل چیں بہ جبیں رہتا ہے

غزلیں

آج قدرت کی مہربانی سے
بجھ گئی پیاس گرم پانی سے
دیدنی تھا جمال چہرے کا
مل کے آئے تھے جب وہ جانی سے
ایسی بے باک تھی ادا اُس کی
ہو گئے ہم تو پانی پانی سے
ہجر میں دل لگائے رکھتے ہیں
آپ کی ایک اک نشانی سے
شاعری اور لُطف دیتی ہے
جب ادا ہو ذرا روانی سے

ممتاز راشد لاہوری

نئے کچھ بھی نہیں اقدام اپنے
وہی معمول کے ہیں کام اپنے

وہ مہکاتے ہیں صبح و شام اپنے
بہت پُرنور ہیں گلفام اپنے

نگاہیں ہو گئی تھیں اُس پہ صدقے
نہارے اُس نے یوں اندام اپنے

عنایت آپ کی جاری ہے پیہم
سنورتے جا رہے ہیں کام اپنے

ہو گیا ختم آپ کا کردار
باہر آ جائیں اب کہانی سے
شاعری کی بیاض پاس نہیں
گیت سُن لیجیے زبانی سے
اک سنگر کے ساتھ رہنا ہے
بچ کے راشد ضرر رسانی سے

ہمیں بھی کچھ گلہ ہو گا نہ اُن سے
جو واپس لیں گے وہ الزام اپنے

بہت نزدیک ہیں شفافیت کے
بہت گہرے نہیں ابہام اپنے

حریفوں کو بتا دے کوئی راشد
لگیں گے اُن سے بہتر دام اپنے

غزل

طویل رات تھی دل کا دیا بجھا ہوا تھا
ہوا رکی ہوئی تھی وقت بھی رکا ہوا تھا

میں خالی ہاتھ چلا تھا تو مجھ کو یاد آیا
جو میرے پاس تھا سب کچھ ترا دیا ہوا تھا

میں جانتا تھا مرے دوست تو نہیں میرا
ترا مزاج کسی اور سے ملا ہوا تھا

ہماری قبر پہ اک شاخ بھی ہری پڑی تھی
اگر ہو یاد تجھے پھول بھی کھلا ہوا تھا

تمہیں ہو یاد کہ اک شاخ سبز تھی جس پر
تمہارے آنے سے اک پھول بھی کھلا ہوا تھا

یہاں میں جس کیلئے لڑ رہا تھا لوگوں سے
وہ شخص دے کے مجھے درد پھر جدا ہوا تھا

کوئی بھی شخص جدا ہو کے مر نہیں پاتا
یہ جملہ ہجر کی دیوار پہ لکھا ہوا تھا

کئی دنوں سے جو اقبال سو نہیں پایا
میں اپنی نیند کی وحشت سے ہی ڈرا ہوا تھا

اقبال سروبہ

غزل

مجھ پہ میرے شہر کے ہر شخص کا احسان ہے
کوئی میری زندگی ہے کوئی میری جان ہے

کس لئے کوئی نگارش میں زمانے کی پڑھوں
بچپنے سے پاس میرے میر کا دیوان ہے

جسم کے زندان سے آزاد کوئی ہو گیا
یار مسجد میں کسی کی موت کا اعلان ہے

رہ رہا ہوں ان دنوں میں ایک ریگستان میں
شہر ہے برباد بستی بھی مری ویران ہے

دل یہ کہتا ہے کہ آئیں گے مسافر لوٹ کر
دل یہ کہتا ہے کہ ملنے کا ابھی امکان ہے

جو ترا طالب نہیں وہ شخص جائے بھاڑ میں
جو ترے کوچے سے باہر ہے، کہاں انسان ہے

کس طرح انصر تمہیں وہ شخص دے گا زندگی
جس کی آنکھوں میں تمہاری موت کا سامان ہے

انصر حسن

غزلیں

اپنے مزاجِ فقر کی مستی کا کیا کروں
دنیا کی حرص و مادہ پرستی کا کیا کروں

سیلِ خیال و خواب سے نکلے نہ زندگی
گردابِ بدگمانیٔ ہستی کا کیا کروں

لاحاصلی کی گرد میں ہیں روز و شب مرے
ایسے میں شوقِ خواب پرستی کا کیا کروں

ممکن نہیں ہے طالبِ دنیا ترا علاج
تیرے دل و دماغ کی پستی کا کیا کروں

دامن بچاؤں کس طرح تہمت کے داغ سے
اے دل! میں تیری حسن پرستی کا کیا کروں

شفیق احمد خان

فلک پہ نور سے جن کے تھی دھوم خاک ہوئے
جو صبح آئی تو ماہ و نجوم خاک ہوئے

جکڑ لیا تھا کسی گرد بادِ وحشت نے
رہِ حیات میں پھر گھوم گھوم خاک ہوئے

جو برگ زرد کی صورت کہیں لرزتے تھے
چلی جو ہجر میں بادِ سموم خاک ہوئے

یہ کیسے درد عطا کر دیے تعلق نے
جو زندگی نے سکھائے علوم خاک ہوئے

دنیا کی وسعتوں کی خبر ہے مجھے مگر
آباد دل میں درد کی بستی کا کیا کروں

کس سمت کو رواں ہے ترے حسن کا سحاب
اب آسماں سے آگ برستی کا کیا کروں

باندھا ہوا ہے کشمکشِ دہر نے شفیقؔ
اس دل کے خوفِ وہم پرستی کا کیا کروں

وبا کے خوف سے ویران ہو گئیں گلیاں
ہر ایک شہر میں اُمڈے ہجوم خاک ہوئے

جو جل رہے تھے کہیں وقت کی منڈیروں پر
بجھے تو بجھ کے چراغِ رسوم خاک ہوئے

شفیقؔ پل میں سبھی اختصاص جاتا رہا
مرے تو خواص تھے یا کہ عموم خاک ہوئے

غزل

محفلِ دل زدگاں سوچنا کیا
یہ نہیں کارِ جہاں ، سوچنا کیا

ٹھیک ہوگا نظر آتا ہے جو ٹھیک
مستیِ خوش نظراں ، سوچنا کیا

یاں تو محتاجِ تصور ہے یقیں
ساکنِ وہم و گماں سوچنا کیا

جیسے لب ہیں ترے تو بول فقط
تجھے اندازِ بیاں سوچنا کیا

سنگ باری کرو آوازے کسو
اے ہجومِ نگراں سوچنا کیا

دیدنی ہے نمِ اندیشۂ چشم
بول دو خوش خبراں سوچنا کیا

جیسی گزری ہے سحرؔ ٹھیک ہے بس
اب کوئی حرفِ زیاں سوچنا کیا

حسنین سحرؔ

غزل

ارشد شاہین

یہ اعتماد مجھے صبح و شام کافی ہے
کسی نظر میں مرا احترام کافی ہے

فراق رات بھی کٹ جائے گی کسی صورت
کسی کی یاد میں گزری ہے شام، کافی ہے

عجب نہیں کہ کسی روز مجھ سے آن ملے
دیارِ خواب میں جس کا خرام کافی ہے

اب اُس کا قرب میسر ہو لازمی تو نہیں
ہے اس کے چاہنے والوں میں نام، کافی ہے

برائے لذتِ کام و دہن زمانے میں
بنامِ عشق فقط ایک جام کافی ہے

اب اور ظلم گوارا نہیں کسی صورت
جو ہو چکا ہے یہاں قتلِ عام، کافی ہے

یہ اور بات کہ ماتھے پہ اک شکن بھی نہیں
درونِ ذات مگر انہدام کافی ہے

کوئی چلے تو کہاں تک قدم ملا کے چلے
میاں یہ وقت ہے اور تیز گام کافی ہے

مری بساط سے بڑھ کر ملا مجھے ارشدؔ
دیا ہے جو بھی خدا نے مقام کافی ہے

غزلیں

رنگوں کا اک جہاں مرے اندر نہیں کھلا
خوشبو کے باوجود گلِ تر نہیں کھلا

لہروں کے ساتھ ساتھ سفر کر رہا تھا میں
تشنہ لبی میں ، مجھ پہ سمندر نہیں کھلا

اک خواب تھا، میں جس کو نہ تعبیر دے سکا
ذہنوں پہ منکشف تھا، زباں پر نہیں کھلا

میں جس پہ دستکوں کے نشاں چھوڑ کر گیا
حیراں ہوں کائنات کا وہ در نہیں کھلا

میں اُس کی جستجو میں رہا ہوں تمام عمر
یہ اور بات مجھ پہ ستم گر نہیں کھلا

محمد نوید مرزا

کھلے ہیں آگہی کے مجھ پہ در آہستہ آہستہ
ہوئی سارے زمانے کی خبر آہستہ آہستہ

ہمیشہ کروٹیں لیتی ہوئی محسوس ہوتی ہے
زمیں محور سے ہٹتی ہے مگر آہستہ آہستہ

کسی آہٹ سے کب کوئی مکاں مسمار ہوتا ہے
چٹخ کر ٹوٹتے ہیں بام و در آہستہ آہستہ

بلندی کی طرف اُن کو ہوائیں لے کے جاتی ہیں
بناتے ہیں پرندے رہگزر آہستہ آہستہ

ہوا تبدیلیوں کی چل پڑی موسم بدلنے سے
ملیں گے اب نئے شام و سحر آہستہ آہستہ

خود اپنی ذات کے بارے میں بھی کب جانتا تھا میں
کھلے مجھ پر مرے عیب و ہنر آہستہ آہستہ

غزلیں

گہری ہے دُھند شام سفر بے چراغ ہے
حدِّ نگاہ ___ راہگزر ___ بے چراغ ہے

دل بے بصر ہے، ذہن پہ چھائی ہے تیرگی
مدت سے آگہی کا نگر بے چراغ ہے

اندھیر!! فرقِ خالق و مخلوق مٹ گیا
میری طرح خدا کا بھی گھر بے چراغ ہے

ہر طاقچے میں دیتی ہے لو یادِ رفتگاں
مانا تمام شہرِ نظر بے چراغ ہے

اے جانِ بزم آ کہ ہو روشن دلِ شہابؔ
تجھ بن سرائے شمس و قمر بے چراغ ہے

شہاب صفدر

فرفر تصویر بولتی ہے
حیرت سے گنگ سامری ہے

خیبور کے کیکروں کو بارش
نہواڑ کے غسل دے رہی ہے

کہنی تھی تو نے جو حکایت
مجھ سے در و بام نے کہی ہے

تنہائی _ سکوت اور اندھیرا
کیا قبر نما یہ کوٹھڑی ہے

غزلیں

تہی دامن میں نقدِ خوش گمانی ڈال لیتا ہوں
میں اک سوکھے ہوئے دریا میں پانی ڈال لیتا ہوں

اگر آسودگی اپنا بسیرا جاوداں کر لے
مصیبت خود پہ کوئی ناگہانی ڈال لیتا ہوں

بھلا دیتا ہوں اپنا مدعا بھی آنے والے کو
میں اُس کے ساتھ اک ایسی کہانی ڈال لیتا ہوں

تری بے کیف باتوں پر بھی ہے اک وجد کا عالم
کہ اُن میں اپنی مرضی کے معانی ڈال لیتا ہوں

پتنگ اُڑتے ہی کٹ جاتی ہے پھر میری محبت کی
کہ اُس میں ڈور کوئی درمیانی ڈال لیتا ہوں

تصدق شعار

تیرنے کو یہاں اب لوگ نہیں آتے ہیں
ڈوبنے والے ہی دریا کو بھی لے ڈوبے ہیں

خاندانوں کو ملانے کا سبب ہیں یہ فرد
خود جو دریا کے کناروں کی طرح رہتے ہیں

اپنے محور سے ہمیں دور نہ ہٹنے دینا
ورنہ دنیا میں بھٹکنے کے بہت رستے ہیں

تو نے دیکھا ہے مری آنکھ کا جھرنا ہی فقط
اور دریا کئی اندر بھی مرے بہتے ہیں

دوستی ان سے بہت خوب رہے گی میری
میں نے دیکھا ہے کہ صحرا بھی مرے جیسے ہیں

غزلیں

ساتھ سورج کے اب کھڑا ہوں میں
اپنے سائے سے تو بڑا ہوں میں

مجھ کو حیرت سے دیکھنے والو
ہجر کی دھوپ میں سڑا ہوں میں

ڈھنگ کا خواب دیکھنے کے لیے
عمر سے نیند میں پڑا ہوں میں

اس کی منزل تو ہے ندی کے پار
اب میں سمجھا فقط گھڑا ہوں میں

خود سے اوصافؔ جنگ ہے میری
خود سے ہی عمر بھر لڑا ہوں میں

اوصاف شیخ

دمکتا رخ لیے جو کر و فر سے نکلا ہوں
میں بچ کے معرکۂ خیر و شر سے نکلا ہوں

میں پھونک پھونک کے رکھتے ہوئے قدم گیا تھا
میں رقص کرتے ہوئے اس نگر سے نکلا ہوں

ہوں گرد باد کی صورت جو ارد گرد ترے
یہ جان لے تری گرد سفر سے نکلا ہوں

وہ جس کے سائے میں تم نے دبا دیا تھا مجھے
میں آج پھر اسی بوڑھے شجر سے نکلا ہوں

میں تیرے ساتھ ازل سے نہیں ہوں سچ کہہ دوں
ترے سفر میں کسی رہگزر سے نکلا ہوں

میں کب سے گم ہوں مجھے کچھ پتہ نہیں ملتا
میں خود کو ڈھونڈنے اوصافؔ گھر سے نکلا ہوں

غزلیں

چراغ چپ ہیں، اندھیرے کا راج ہے شاہد
ہوائے شام کا اپنا مزاج ہے شاہد

بڑھا رہے ہو مری سمت ہاتھ تم لیکن
جو درمیان کھڑا ہے سماج ہے شاہد

ہمارے شہر میں پھولوں کا نام رکھتے ہیں
ہمارے شہر کا الٹا رواج ہے شاہد

ہمارے سر سے بلاؤں کو کون ٹالے گا
ہمارے سر پہ محبت کا تاج ہے شاہد

کبھی کسی کے نوالے نہیں گنے ہم نے
ہمارے پاس تو اپنا اناج ہے شاہد

جمالِ یار سے سارا چمن مہکتا ہے
جمالِ یار کا سارا خراج ہے شاہد

ہمارے نخلِ تمنا سے برف جھڑنے لگی
سراجِ شوق بلندی پہ آج ہے شاہد

افتخار شاہد

تری صورت نہیں، لہجے سے تجھے جانتا ہوں
میں جو آواز کے ناطے سے تجھے جانتا ہوں
میں ترے نام سے واقف بھی نہیں ہوں لیکن
اجنبی شخص! میں عرصے سے تجھے جانتا ہوں
تو کسی اور حوالے سے مجھے جانتا ہے
میں کسی اور حوالے سے تجھے جانتا ہوں
مرے معبود! گناہوں میں گھرا ہوں لیکن
تری رحمت کے قرینے سے تجھے جانتا ہوں
تری رنگت یا خد و خال سے کیا لینا ہے
تُو ہے یاروں کے علاقے سے! تجھے جانتا ہوں
اے مرے دل کو سلیقے سے چرانے والی
میں ترے طور طریقے سے تجھے جانتا ہوں

گلفروشوں سے فقط اتنا تعارف ہے مرا
ایک گل پوش دریچے سے تجھے جانتا ہوں
زندگی تجھ سے تعلق ہے تو چپ ہوں ایسے
ورنہ میں ایک زمانے سے تجھے جانتا ہوں
تجھ کو چھونا تو اضافی تھا مرے پھول بدن
تری خوشبو سے، پسینے سے تجھے جانتا ہوں
شعر کہتا ہوں ترے حسن پہ اکثر شاہد
مری محبوب سلیقے سے، تجھے جانتا ہوں

غزل

پسِ غبار مجھے اس طرف کو جانے دے
نگاہ دار! مجھے اس طرف کو جانے دے

فلک کے خاص رسالے میں کاش چھپ جائے
یہ اشتہار ''مجھے اس طرف کو جانے دے''

طلسمِ وقت کا زندان توڑنا ہے مجھے
رہِ فرار! مجھے اس طرف کو جانے دے

گلِ مراد خزاں سے بکھر نہ جائے کہیں
پئے بہار مجھے اس طرف کو جانے دے

ہے میرا ذوقِ تجسس کہ اس طرف کیا ہے؟
بس ایک بار مجھے اس طرف کو جانے دے

میں کائنات کی حد سے نکلنا چاہتا ہوں
فسونِ یار! مجھے اس طرف کو جانے دے

میں دیکھ سکتا نہیں گرد میں نظارے کو
مرے غبار! مجھے اس طرف کو جانے دے

متاعِ عشق ہے گردی مرے پلٹنے تک
جمالِ یار! مجھے اس طرف کو جانے دے

مری دعا ہے خرابے کے اس طرف جائے
یہی پکار..... ''مجھے اس طرف کو جانے دے''

اسحاق وردگ

غزل

وہ حب جس کی ذکی تمثیل بحرِ بے کراں تک ہے
مآل اس کا بھی صد افسوس بس اک داستاں تک ہے

مکاں سے لا مکاں تک ہے زمیں سے آسماں تک ہے
ہماری ذات کی وسعت خدا جانے کہاں تک ہے

مری خانہ خرابی پر نہ جا قسمت ہے یہ میری
مری تخئیل کی تعمیر بھائی لامکاں تک ہے

تو پھر کیونکر نہ خوشبو دیں وجود و فن کی میراثیں
علاقہ ہی مرا جبکہ چمن سے گلستاں تک ہے

ملاقاتوں میں تیری والہانہ پن نہیں ملتا
تو کیا تیری محبت محض اے ہمدم زباں تک ہے

گریزاں ہے وہ میرے نام کی پرچھائیوں سے بھی
نہیں معلوم تھا مجھ سے اسے نفرت یہاں تک ہے

نشانہ جس کا بس میرا تنِ نازک ہے اے یارو
رسائی ایسے ہر اک تیر کی اس کی کماں تک ہے

مجھے مت دیکھ تو پرواز کی عظمت پہ رکھ نظریں
مری گردِ سفر تاروں کی دلکش کہکشاں تک ہے

ذکی طارق

غزلیں

اُداسی کا سماں ہے ، تُو کہاں ہے
بہر جانب خزاں ہے ، تُو کہاں ہے

کہیں ہے تُو مرے دل میں ، ولیکن
نگاہوں سے نہاں ہے، تُو کہاں ہے

جہاں بھی ہے مجھے آواز دے دے
یہاں ہے یا وہاں ہے ، تُو کہاں ہے

بچھڑ کر بھی ، ابھی تک نام تیرا
مرے وردِ زباں ہے ، تُو کہاں ہے

جہانِ قلب میں مدت سے پیارے
بپا ، آہ و فغاں ہے ، تو کہاں ہے

زمانے سے نہیں کوئی گلہ بھی
زمانہ مہرباں ہے ، تُو کہاں ہے

صدائیں دے رہا ہے تجھ کو ، شوکت
بتا دے تُو کہاں ہے ، تُو کہاں ہے

شوکت محمود شوکت

چہرۂ گُل ، شگفتہ تر سا لگا
دشتِ ویراں بھی ، اپنے گھر سا لگا

شہر بھر میں سبھی فرشتے ہیں
شہر بھر سے عجیب ڈر سا لگا

اب کے ، قحط الرجال ہے ایسا
بے ہنر بھی تو با ہنر سا لگا

تیر ، باتوں کے دل پہ لگتے رہے
لہجۂ یار ، تلخ تر سا لگا

ایک صورت پہ مر مٹے ہم بھی
ایک پتھر ، ہمیں گہر سا لگا

عارضی ہے یہ رونقِ ہستی
حسنِ عالم بھی مختصر سا لگا

صورتِ قیس ، آج شوکت بھی
اپنی حالت سے بے خبر سا لگا

غزل

بوجھ جب مفلس و نادار پہ آ جاتے ہیں
زلزلے شاہوں کے دربار پہ آ جاتے ہیں

مرحلے آخری جب پیار پہ آ جاتے ہیں
فیصلے باپ کی دستار پہ آ جاتے ہیں

نامہ لکھ کر اُسے بھجوانے کی خواہش جو کروں
سب کبوتر میری دیوار پہ آ جاتے ہیں

تو جو شرماتا ہے اظہار محبت سُن کر
رنگ سارے تیرے رخسار پہ آ جاتے ہیں

ایسا لگتا ہے کہ ہر شاخ ثمر بار ہوئی
جب پرندے کبھی اشجار پہ آ جاتے ہیں

اپنے شجرے میں تو ظالم کی اطاعت ہی نہیں
ہم اُٹھائے ہوئے سر، دار پہ آ جاتے ہیں

لوگ سیلاب میں بڑھتے ہیں کناروں کی طرف
اور ہم سر پھرے منجدھار پہ آ جاتے ہیں

بیچ دی جاتی ہے جب اپنے قلم کی حرمت
جھوٹ سب مُلک کے اخبار پہ آ جاتے ہیں

مکڑیاں جھوٹ کی بُنتی ہیں جو دنیا میں عقیل
وُہی جالے سبھی کردار پہ آ جاتے ہیں

عقیل رحمانی

غزلیں

تتلی کے پر و بال بنانے میں لگی ہوں
جگنو کو نئی راہ دکھانے میں لگی ہوں

وہ ہیں کہ پرندوں کو بھی جینے نہیں دیتے
میں ہوں کہ فقط پیڑ اگانے میں لگی ہوں

اب تک تو تجھے، دل سے اتارا نہیں میں نے
اب تک میں ترا، ہجر منانے میں لگی ہوں

کیا میں بھی، تری آنکھ کا، پتھر ہوں بتا یہ
کیا میں بھی ترے خواب مٹانے میں لگی ہوں

زیب النسا زیبی

انسان کوئی بھی تو فرشتہ بنا نہیں
سچ پوچھیے تو کوئی یہاں بے خطا نہیں
قائم رہے جو توبہ پہ ساقی کے روبرو
ایسا تو میکدے میں کوئی پارسا نہیں
ہم ہیں قصور وار ہمیں اعتراف ہے
تہمت لگانے والے بھی تو دیوتا نہیں
وہ جس کو اپنے دل کا فسانہ سنا سکیں
ہم کو تو ایسا شخص ابھی تک ملا نہیں
چہرہ بدل بدل کے وہ آیا ہے بار بار
لیکن کسی بھی چہرے میں مجھ سے چھپا نہیں

غم پہ مجھے رونا، نہیں آتا ہے، بہت دیر
خوشیاں میں ترے جگ سے چُرانے میں لگی ہوں

تاروں سے محبت ہے، اسی واسطے زیبی
بچوں کو نئے گیت سنانے میں لگی ہوں

وہ بے وفا تھا چھوڑ کے مجھ کو چلا گیا
میں بھول جاؤں اس کو، مگر بھولتا نہیں
کشتی کو تو نے چھوڑ دیا یوں ہی نا خدا
کیا تو سمجھ رہا ہے ہمارا خدا نہیں
اس کے قریب جاؤں تو ملتا نہیں ہے وہ
اور دور ہو بھی جاؤں تو مجھ سے جدا نہیں
زیبی رفیق ہوتے ہیں سب اچھے دور کے
جب وقت ہو کڑا کوئی پہچانتا نہیں

غزل

درد کے دل سے رابطے ہیں ابھی
اور کچھ غم کے ضابطے ہیں ابھی

ہم نے پائی ہیں قربتیں ایسی
جن میں صدیوں کے فاصلے ہیں ابھی

منزلیں ہم کو ڈھونڈ ہی لیں گی
راستے اس طرف چلے ہیں ابھی

دیکھنا پھر سے آئے گا طوفان
چند شاخوں پہ گھونسلے ہیں ابھی

سانحے کچھ گزر چکے ہیں جلیلؔ
کچھ تعاقب میں حادثے ہیں ابھی

احمد جلیل

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پیڑ کب ؟ دامنِ صحرا پہ ہَرے دھبّے ہیں
تُو کہاں؟ حرف کی مٹھی میں ترے ریزے ہیں

غزل

سجی لبوں پہ تبسم ، اداس میرا دل
مزاجِ کرب کا تیور شناس میرا دل

مقامِ شکر کہ کوئی تو میرا اپنا ہے
زمانہ تیرا سہی، میرے پاس میرا دل

غزل کی شاخ پہ اشکوں کا بور آتا ہے
نکالتا ہے جب اپنی بھڑاس میرا دل

میں مبتلا ہوں ترے عشقِ خاص میں کیونکر
جواز اس کے رکھے سو پچاس میرا دل

میں اپنے سینے کی دھک دھک پہ ناز کرتا ہوں
کہ پالتا نہیں خوف و ہراس میرا دل

یہی ہے میری فضیلت، یہی مرا اعزاز
ہمیشہ کرتا ہے حسنِ قیاس میرا دل

قبول کی گئی جب عرضداشت میری کہ رد
ہوا عزیز سراپا سپاس میرا دل

عزیز فیصل

غزلیں

ساغر یا پھر نینوں سے مے نوشی کی
یار وجہ کچھ ہوتی ہے مدہوشی کی

کل بھی بزم یاراں میں تھی بات چلی
کل بھی میں نے اُس کی پردہ پوشی کی

ملنا مشکل تھا تو مجھ کو بتلاتے
تم نے جانے کیونکر یوں روپوشی کی

سرد ہَوا کو لمس ملا جب آنچل کا
اُس نے میرے کانوں میں سرگوشی کی

کیا تھا اُس کا شعر، کہ مارا جاؤں گا"
ہاں میں نے آواز سنی تھی دوشی کی

تھوڑا سا ان ہونٹوں کو بھی جنبش دو
چیخ سنائی دیتی ہے خاموشی کی

عجلت میں ہر کام بگڑتا ہے ارشد
جھولی بھرتی ہے آخر سنتوشی کی

ارشد محمود ارشد

جب کسی ذات سے محبت کی
اُس کی ہر بات سے محبت کی

چار خوشیاں کشیدنے کے لیے
لاکھ صدمات سے محبت کی

تم تو پیرس کی بات کرتے ہو
میں نے گجرات سے محبت کی

دھوپ کو بھی عزیز تر جانا
اور برسات سے محبت کی

راز فطرت کے مجھ پہ کھلتے گئے
جب مضافات سے محبت کی

دن کی تلخی اُنڈیل کر خود میں
چاند نے رات سے محبت کی

ہم تو مثلِ صبا رہے ارشد
خار، گل، پات سے محبت کی

غزل

اپنے رستے کو موڑ سکتا ہے
جس نے جانا ہے چھوڑ سکتا ہے

باغ سے پھول توڑنے والا
چاہے تو دل بھی توڑ سکتا ہے

آج وہ رو رہا ہے اشکوں سے
جو تری آنکھ پھوڑ سکتا ہے

کچھ خراشیں تو پھر بھی رہتی ہیں
آئنہ کون جوڑ سکتا ہے

عمران اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

خالد شعور شعر کہاں تھا مجھے ، مگر
اظہار کی خلش تھی کہ شاعر بنا گئی

غزل

وسطِ سینہ میں غم کی تپش ہے، فضا گرم ہے
اِستوائی مقاموں کی آب و ہوا گرم ہے

کیا کریں سیر جا کر تناظُر کے قطبین میں
اِن دنوں تو وہاں کا بھی موسم بڑا گرم ہے

معتدل ہے وہ حیرت کدہ، جس میں رہتے ہو تم
جس میں ہم رہ رہے ہیں وہ حسرت سرا گرم ہے

گہما گہمی ہے کون و مکاں کے ہر اسٹال پر
خوش ہے مالک کہ بازارِ ارض و سما گرم ہے

ولولے کی تمازت سے ہیں دل کی سرگرمیاں
زندگی کی حرارت سے خطّہ مرا گرم ہے

بیکرانی میں گھومے پھرے ہیں، پتہ ہے ہمیں
کون سا منطقہ سرد ہے، کون سا گرم ہے

بھاپ اُڑاتے ہوئے چند چشموں کے سنگم پہ ہوں
یخ دنوں میں بھی میرا بہاؤ ذرا گرم ہے

جل چکی لمس کی حس ہماری تو بتلائیں کیا
گرم و سردِ زمانہ میں کیا سرد، کیا گرم ہے

موڑ لوں گا کہ اب تک لچک دار ہے دل مرا
ڈھال لوں گا کہ اب تک تو لوہا مرا گرم ہے

شاہد ماکلی

غزلیں

کرتا مجھے وہ اتنا پریشان بھی نہیں
پَر اُس کے ساتھ رہنا تو آسان بھی نہیں

بچوں نے اُس کو مارے ہیں کس لیے پتھر
اُس کا تو آج چاک گریبان بھی نہیں

آندھی کی صورت آیا، گلی سے گزر گیا
اُس نے اُٹھایا آج اِک طوفان بھی نہیں

زبیر فاروق

کرو اَب غور تم سنجیدگی سے
نہ ہو گا کچھ بھی اِس مردہ دِلی سے

تمسخر ہے اُڑائے ہر کوئی ہی
مجھے خوف ہے آتا اِس ہنسی سے

مجھے ڈر موت کا رہتا ہے ہر پل
ڈرا جاتا میں تو اُس گھڑی سے

نہیں ہے ساتھ میں سایا بھی ہوتا
گزرتا ہوں میں ایسے چپ گلی سے

مُنہ کس لیے وہ پھیرتا ہے مجھ کو دیکھ کر
وہ جس کے ساتھ جان اور پہچان بھی نہیں

فاروقؔ بس گیا ہے کس طرح سے دل میں وہ
اک اجنبی ہُوا ہی جو مہمان بھی نہیں

پڑا رہتا ہوں اَب میں تیرگی میں
ہُوا جاتا ہوں اندھا روشنی سے

نہیں فاروقؔ تُو بھی اَب تو ہمدم
ہوں اُکتایا بہت تیری کمی سے

غزل

ہو گا یہ پورا خواب مرے بعد دیکھنا
آئے گا انقلاب مرے بعد دیکھنا

سمجھا نہیں ہے اُس نے ابھی تک سوال کو
لکھے گا وہ جواب مرے بعد دیکھنا

کر لوں گا میں گوارا تری بے وفائی کو
تم پیار کا یہ خواب مرے بعد دیکھنا

پڑ جائے گا یہ رنگ ترا ماند ایک دن
ڈھل جائے گا شباب مرے بعد دیکھنا

سوکھے ہوئے گلاب ملیں گے تمھیں ضرور
کھولو گے جب کتاب مرے بعد دیکھنا

روئے زمین پر نہ رہے گا کوئی وجود
اترے گا اِک عذاب مرے بعد دیکھنا

لکھتا رہوں گا شعر اسی شوق سے حکیمؔ
چھپ جائے گی کتاب مرے بعد دیکھنا!

حکیم خان حکیم

غزل

ہوئے جو بند کچھ رستے، کئی بہتر نکل آئے
عدو نے ہاتھ کاٹے تو ہمارے پر نکل آئے

نظر آتی کہاں تھیں دوستو خود گردنیں کل تک
یہاں جن گردنوں پر اب کشیدہ سر نکل آئے

بس اِک تُو ہی مری آواز پر نکلا نہیں باہر
ہزاروں لوگ میری خامشی سن کر نکل آئے

ہمیں ہر جوہری نے اپنے اپنے ظرف سے پرکھا
کہیں یاقوت نکلے تو کہیں پتھر نکل آئے

وہاں پر اپنے ہونے کی ہمیں خود بھی خبر کب تھی
جہاں سے آپ کے آواز دینے پر نکل آئے

تخیل کا فلک سے پھوڑنا سر رائیگاں کب تھا
سخن کے دوسری دنیا میں بھی یوں در نکل آئے

رسائی خود تلک دی جس طرح عزمیؔ زمانے کو
مرا دشمن بھی ممکن ہے مرے اندر نکل آئے

عزم الحسنین عزمی

غزل

جل سے رشتہ تھا سو لہروں کو بڑے قیمتی تھے
کچی مٹی کے وہ دریا کو گھڑے قیمتی تھے

دل کو دریا سے پہاڑوں سے کبھی دشت سے عشق
سنگِ وحشی کو محبت کے دھڑے قیمتی تھے

تحفہ تحفہ تھا محبت میں مری کھوٹ نہ تھا
چاہے پیتل تھا کلائی کے کڑے قیمتی تھے

تیرے ہونٹوں سے مرے حرف کی توقیر بڑھی
پھول بن کے جو ترے لب سے جھڑے قیمتی تھے

دل کی دھڑکن کا زمانے میں کہیں مول نہ تھا
اور جو پتھر تھے وہ شیلفوں میں پڑے قیمتی تھے

تیرے رستے سے عقیدت میں اُٹھا لائے ہیں
سنگ جتنے تھے سرِ راہ جڑے قیمتی تھے

عاطف جاوید عاطف

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تو فقط خواب تھا ہم خواب کی تعبیر ہُوے
پئے تقلید چلے ، در پئے تکفیر ہُوے

غزلیں

ہزار میری طلب میری جستجو روئے
مگر یہ اب بھی گوارا نہیں کہ تو روئے

اکیلے رونا کہاں سہل تھا جدائی میں
بٹھا کے پہروں تجھے اپنے روبرو روئے

بہت ہنسا ہے دلِ زار کے تڑپنے پر
وہی کہ جس کی محبت میں ہم لہو روئے

اداسیوں سے نبھائی مگر قرینے سے
کہاں کہ درد چھڑا اور کو بکو روئے

یہی کہ پیار کا اظہار کر لیا ہم نے
مگر جو لوگ بنا عرضِ آرزو روئے

جہاں اکٹھے ٹہلتے تھے شام سے پہلے
اکیلا دیکھ کے مجھ کو وہ آبجو روئے

محبتوں سے بسی جھونپڑی رہی ہنستی
بغیر پیار کے جاذبؔ یہ کاخ و کو روئے

اکرم جاذب

ماضی ہوا ہے وقت کی پرچھائیوں میں گم
میں ہوں غمِ حیات کی کٹھنائیوں میں گم

ہر اک ہے اپنی ذات کی تحسین میں مگن
ہر کوئی اپنے اپنے ہی شیدائیوں میں گم

ہم لوٹ آئے گھر کو بنا عرضِ مدعا
وہ آج پھر تھے اپنے تمنائیوں میں گم

جھپکی نہیں ہے آنکھ مگر شب گزر گئی
دل تھا پھر ان کی یاد کی رعنائیوں میں گم

کچھ روز رابطوں میں کمی کر کے دیکھ لو
جاذبؔ رہو ذرا سخن آرائیوں میں گم

غزل

تمثیلوں میں ساری باتیں کرتی تھی
وہ غالب کے مصرعے جیسی لڑکی تھی

میں تو اُس کو دیکھ کے چپ سا رہتا تھا
وہ بھی دل کی باتیں دل میں رکھتی تھی

اُس کو تتلی کے پر اچھے لگتے تھے
اور کتابوں میں وہ پھول سجاتی تھی

اب تک گھوم رہا ہوں بھول بھلیوں میں
اُس نے ایک پہیلی ایسی ڈالی تھی

میں نے جیسے سچ مچ اُس کو چھوڑ دیا
چھوٹے سے اک جھوٹ پہ کتنا روئی تھی

ایک زمانہ بیت گیا میں سوچتا ہوں
مہندی سے وہ ہاتھوں پر کیا لکھتی تھی

جانے کیسی ہو گی اُس کی تنہائی
وہ تو اپنی آہٹ سے بھی ڈرتی تھی

وہ کیا جانے میں نے مات ہی چاہی کیوں
اپنی جیت پہ وہ اترائی پھرتی تھی

اب میں اس کے سوکھے پتے چنتا ہوں
وہ جس پیڑ کے نیچے بیٹھا کرتی تھی

شاید وہ جبرانؔ محبت تھی میری
غیر تھی لیکن اپنی اپنی لگتی تھی

وسیم جبران

غزل

رُت بھی تبدیل ہوئی سال بھی تبدیل ہُوا
عہدِ ماضی کی طرح حال بھی تبدیل ہُوا

شاخ در شاخ بہت خوش ہیں پرندے لیکن
اِن کو معلوم نہیں جال بھی تبدیل ہُوا

مطمئن تھے کہ خریداری کریں گے ہم بھی
نرخ تبدیل ہوئے مال بھی تبدیل ہُوا

یہ جو تصویر ہے تصویر کسی مہ رُو کی
وہ جو رخسار پہ تھا خال بھی تبدیل ہُوا

میں نے جس شخص کو بدلا تھا بڑی محنت سے
اُس کے ہاتھوں سے زرِ فال بھی تبدیل ہُوا

کتنا تبدیل ہُوا پچھلے برس بھی یہ اسدؔ
دیکھتے دیکھتے امسال بھی تبدیل ہُوا

اسد اعوان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

پانی اُتر گیا ، مگر آنکھیں بجھا گیا
سیلِ جمال اپنا نشاں تک مٹا گیا

غزل

عشق گر با وفا نہیں ہوتا
حسن بھی دیرپا نہیں ہوتا

دل سے جب دل جُدا نہیں ہوتا
ہجر کا مرحلہ نہیں ہوتا

بخت والوں کو ہجر ملتا ہے
درد یہ خود چُنا نہیں ہوتا

ہجر بھی آسمانی تحفہ ہے
یہ سبھی کو عطا نہیں ہوتا

ہجر میں جس قدر سکون ملے
وصل میں وہ مزا نہیں ہوتا

ایسا اُلجھا ہوں اس کی اُلجھن میں
زُلف سے میں رہا نہیں ہوتا

کیوں بھٹکتی ہیں دید کو آنکھیں
تم سے جب رابطہ نہیں ہوتا

جب اُسے ڈھونڈنے نکلتا ہوں
پاس اُس کا پتا نہیں ہوتا

میں نہ کرتا تباہ خود کو اگر
مجھ میں یوں وہ رچا نہیں ہوتا

اس قدر تلخیاں بدن میں ہیں
زہر سے بھی نشہ نہیں ہوتا

دستکیں چیختی ہی جاتی ہیں
اُس کا دروازہ وا نہیں ہوتا

تم نہ بخیہ گری اگر کرتے
چاک دامن سلا نہیں ہوتا

روبرو آفتاب ہوتا ہے
پھر کوئی دوسرا نہیں ہوتا

آفتاب خان

غزل

کسے خبر کہ ترے دم سے ہی گلاب مرے
نکل رہے ہیں کئی واہموں سے خواب مرے

زبور وقت کسے سونپ آئے عجلت میں
مجھے سنبھال ذرا دیر اضطراب مرے

کوئی خیال مرے گال سرخ کرتا ہے
کسی خیال سے کمزور ہیں حساب مرے

وہی گمان مجھے با یقین رکھتے ہیں
ازل سے تا بہ ابد ہیں جو ہم رکاب مرے

تمہارے زعم سے میری رضا بندھی ہوئی ہے
تمہاری ذات سے مشروط ہیں غیاب مرے

نعیم رضا بھٹی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی مجھے سنوار رہا ہے تراش کر
پتھر کے پاس تیشہ بکف کون آ گیا

غزل

مدارِ ذات کے گرداب سے نکل آؤں
میں اپنی ذات کے اسباب سے نکل آؤں

بس ایک بار تو پانی پہ اپنا عکس دکھا
قسم خدا کی میں سیلاب سے نکل آؤں

جو محوِ رقص نہ ہوں میری روح کے ہمراہ
میں ایسے حلقۂ احباب سے نکل آؤں

میں اپنی جاگتی آنکھوں سے زندگی دیکھوں
مری تمنا ہے میں خواب سے نکل آؤں

ترا تو لہجہ بہت دل شکن ہے اے جاناں!
تری کہانی کے ہر باب سے نکل آؤں

جو تیرے لمس کی حدت کو جیت لوں تو میں
پھر اپنی ذات کے برفاب سے نکل آؤں

گندھا ہوا ہے مری ذات کے خمیر میں یہ
میں کیسے عالمِ اسباب سے نکل آؤں

یہ روشنی مری تہذیب کا ہی حاصل ہے
میں کیسے حلقۂ احباب سے نکل آؤں

جو میرا پیار ہے رومی! اگر کبھی مل جائے
میں اپنی ذات کے ہر خواب سے نکل آؤں

رومانہ رومی

غزل

وفاؤں کا سفر کرتے ہوئے جیون گزر جائے
ترے ظلم و ستم سہتے ہوئے جیون گزر جائے

وہ محفل سے اٹھائے گر تجھے غیروں کے کہنے پر
تو یوں اُٹھنا کہ بس اُٹھتے ہوئے جیون گزر جائے

مسلسل ایک جیسی زندگی بے کیف ہوتی ہے
کبھی روتے کبھی ہنستے ہوئے جیون گزر جائے

عداوت کا بگولا درمیاں کوئی نہ در آئے
سدا ہنس کر گلے ملتے ہوئے جیون گزر جائے

ترے آنے کی فرحت اور کبھی صدمہ نہ آنے کا
یونہی مرتے یونہی جیتے ہوئے جیون گزر جائے

کبھی نظمیں کبھی غزلیں کبھی نغمے بہاروں کے
تمھارے پیار میں لکھتے ہوئے جیون گزر جائے

حصول اس کا ہے ناممکن مگر راہِ محبت میں
کبھی رکتے کبھی چلتے ہوئے جیون گزر جائے

چلو فرحاںؔ ابھی اُس بے وفا کو ڈھونڈ کر لائیں
کہیں ایسا نہ ہو روتے ہوئے جیون گزر جائے

سرور فرحان

غزل

میری چاہتیں بھی تو خام تھیں تیرے عشق کو بھی زوال تھا
نہ ہی تجھ کو تھیں مری چاہتیں نہ ہی تجھ کو میرا خیال تھا

لیے دل میں کتنی کدورتیں یہ جو عمر ساتھ گزار دی
تری صلح جوئی بھی ہے سبب مرے ضبط کا بھی کمال تھا

تو چلا گیا مجھے چھوڑ کر تو زباں زمانے کو مل گئی
مرے حق میں تو مرے مہرباں مرے اعتماد کی ڈھال تھا

نہ وہ عشق میں رہیں شدتیں نہ وہ گفتگو میں حلاوتیں
سو یہ کیوں نہ سمجھوں کہ ہم نفس ترے دل کے شیشے میں بال تھا

مرے سامنے وہ نہ تھا مگر مری روح میں رہا جلوہ گر
کہ جدھر جدھر بھی نظر گئی تو اُسی کا عکس جمال تھا

یہ جو مجھ سے تو ہے خفا خفا یہ بتا ذرا ہوئی کیا خطا
یہی اب بھی تجھ سے سوال ہے یہی ایک میرا سوال تھا

اب اُسی کے بن میری زندگی جو گزر رہی ہے ہنسی خوشی
کبھی ایک لمحہ گزارنا بھی بغیر جس کے محال تھا

نائیلہ راٹھور

غزل

جسم کے ریگزار سے نکلے
مرنے والے شمار سے نکلے

روشنی کے لیے ضروری ہے
چاند بھی زلفِ یار سے نکلے

وہ بھی ٹھہرا ہوا ہے رستے میں
ہم بھی اِک انتشار سے نکلے

واسطہ تھا کسی محبت کا
پھول کچھ خارزار سے نکلے

خوب گزرا ہے دن جدائی کا
ہم شبِ انتظار سے نکلے

آئینہ جب بنا لیا عاصمؔ
عکس قرب و جوار سے نکلے

عاصم اعجاز

غزل

ڈوبتے دیکھتا تھا یار مجھے
اور کہتا رہا پکار مجھے

سر اٹھانے سے ہو گیا قاصر
بوجھ لگنے لگا خمار مجھے

نام لے کر بُلایا تھا اُس نے
روندنی پڑ گئی قطار مجھے

خُود پہ بس چل نہیں رہا میرا
چاہیے تجھ پہ اختیار مجھے

خام ہوں ، پختہ ہو گیا جس دن
پیش کر دے گا پیش کار مجھے

اشک پتھرا نہ جائیں آنکھوں میں
رونا پڑتا ہے بار بار مجھے

ضد لگائے کھڑا ہوں ساحل پر
موج ہی لے کے جائے پار مجھے

خالد عدنان

غزل

یہ آخری مکان تھا جس کا مکیں کیا
لو آج ہم نے تم کو سپردِ زمیں کیا

جب خد و خال مٹنے پہ آئے تو اس گھڑی
خود کو کیا درست رویہ حسیں کیا

جس دن مشاورت تھی مری زندگی کے ساتھ
اس موت نے بھی جلسہ اُسی دن وہیں کیا

اس اہتمام سے کیا سجدہ وہ آخری
سنگِ درِ حبیب کو اپنی جبیں کیا

ہر اک سے ہمکلام ہوئے خود کو چھوڑ کر
سب سے اہم تھا کام جو ہم نے نہیں کیا

طاقت سبھی کے پاس تھی کردار کی جناب
ظاہر کی اس شکست کو فتحِ مبیں کیا

وہم و گماں میں کب تھا بچھڑنا ترا عطا
پھر یوں ہوا کہ وہم و گماں پر یقیں کیا

عطاالعزیز

غزل

کوئی اعصاب پر سوار ہوا
شہرِ دل میں بھی انتشار ہوا

اندروں تیرا آشکار ہوا
بس وہیں ختم اعتبار ہوا

میرے زخموں کا جب شمار ہوا
ذکر تیرا ہی بار بار ہوا

اور پھر رہ گئی پڑھائی بھی
یوں دل و جان سے نثار ہوا

کیا پتہ کس کماں سے نکلا تھا
تیر کوئی جگر کے پار ہوا

کتنا مشکل تھا دام میں لانا
کتنی آسانی سے شکار ہوا

بس دکھی لوگ یاد رکھتے ہیں
دل کسی پیر کا مزار ہوا

شور اٹھا غوطہ خور ڈوب گئے
گویا دستِ ہنر پہ وار ہوا

ایک جوڑی بچھڑ گئی احمد
اور ویران سبزہ زار ہوا

احمد محسود

غزل

عشق کا کاروبار کرتا ہوں
اور خسارے شمار کرتا ہوں

دن گزرتا ہے ساتھ سورج کے
شب کو تارے شمار کرتا ہوں

میں شجر سا مزاج رکھتا ہوں
میں پرندوں سے پیار کرتا ہوں

دنیا جو بھی کہے ترے بارے
میں کہاں اعتبار کرتا ہوں

تیری تصویر سامنے رکھ کر
اُس سے باتیں ہزار کرتا ہوں

میں جلا کر چراغ رستے پر
یوں ترا انتظار کرتا ہوں

جاہلوں کے مقابلے میں رضا
خامشی اختیار کرتا ہوں

سید فرخ رضا ترمذی

غزل

درد جاگے تو خواب سوتے رہے
ہم بھی ایسے میں خوب روتے رہے

زندگی بوجھ بن گئی تھی مگر
ہم اُسے خوش دلی سے ڈھوتے رہے

ہم بدلتے رہے لباسِ سخن
یوں خوشی کو غموں میں جوتے رہے

یک بہ یک اشکِ نارسا کل شب
روح کا پیرہن بھگوتے رہے

ہم بھی سب کی خوشی میں خوش ہو کر
عمر بھر اپنا غم بلوتے رہے

عابدی جو بکھر گئے تھے کبھی
وہ تعلق سبھی پروتے رہے

علی حسین عابدی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

مرنے کے بھی ان گنت بہانے
جینے کو بھی لاکھ مسئلے ہیں

غزل

پھر وہی ہے حصار پہلا سا
دل کو ہے انتظار پہلا سا

کچھ تو تفصیل ہو کہانی کی
جانے کیوں اختصار پہلا سا

تھک چکا ہے سفر کی وحشت سے
اب نہیں ہے سوار پہلا سا

پھر وی ایک بدگمانی ہے
کیوں نہیں اعتبار پہلا سا

ہو گیا ہوں میں گردشوں کا اسیر
اب کہاں ہوں میں یار پہلا سا

کیا ہوا ہے جنون کا غلبہ
آ گیا انتشار پہلا سا

پھر دسمبر کی سرد شامیں ہیں
دل ہوا بے قرار پہلا سا

طلعت شبیر

غزل

دی گئی ہر صدا کا محور ہے
عشق کے مدعا کا محور ہے

جس نے جینا سکھا دیا مجھ کو
وہ مری ہر دعا کا محور ہے

میں کہ مطلوب ہی نہیں اس کو
وہ کہ میری بقا کا محور ہے

وہی محور ہے میری سوچوں کا
وہی صوت و نوا کا محور ہے

کون سمجھائے جا کے یہ اس کو
وہ مری التجا کا محور ہے

رخسانہ سمن

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

تجھ سے تو اٹھ سکے گا نہ یہ بارِ دوستی
مجھ پہ نہ آ پڑے کہیں دیوارِ دوستی

غزل

یوں اس کو اپنانے تک
اپنا آپ بنانے تک

چل پڑتے ہیں نیند میں بھی
پھر اک خواب کے آنے تک

تکیہ بھیگا رہتا ہے
تیرا راز چھپانے تک

آس کی کھڑکی کھلتی ہے
کوئی بات سنانے تک

سائے چلتے رہتے ہیں
اک چہرہ اپنانے تک

دریا چاند ستارا میں
سب ہیں آنے جانے تک

دل پر چوٹ کا حاصل بھی
بس اک پیار جتانے تک

خواب کو زندہ رکھا ہے
ظالم تیرے آنے تک

آسناتھ کنول

غزل

رضا اللہ حیدر

شاید حریمِ قدس کی کوئے جناں کی ہے
چڑھتی ہے آسمان کو مٹی کہاں کی ہے

ٹھنڈی ہوائیں درد کی سوغات لے اُڑیں
تاثیر اس قدر مرے اشکِ رواں کی ہے

اس کی محبتوں میں ہوئے معرکے عجب
گویا کہانی جنگ کی تیر و سناں کی ہے

میں حلقۂ غبارِ سفر کا مکیں ہوا
رہزن کو کیوں تلاش مرے آشیاں کی ہے

پھرتے ہیں لے کے آنکھ میں خوابوں کی کھیتیاں
حالت عجیب شہر میں پیر و جواں کی ہے

آخر رضا ہوا ہی کرے گی ہوا اُسے
احباب کو جو فکر لحد کے نشاں کی ہے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کیا جانیے کب خالد کس رخ ہمیں لے جائے
کیا جانیے اس در تک کیا رنگ ہوا کا ہو

غزل

اُس کو ابد تلک یہ میسر ہے زندگی
جس کو خبر ہے دہر میں کیونکر ہے زندگی

جیسے بھی چاہے دیکھ لو اس کو پرکھ کے تم
سب موتیوں سے قیمتی گوہر ہے زندگی

خوش فہم موج موج ہے، ظن ہے بھنور بھنور
وہم و گماں کا ایک سمندر ہے زندگی

مئے خانۂ حیات میں رہتے ہو اور تم
اتنا نہ جان پائے کہ ساغر ہے زندگی

بے جان کوئی چیز نہیں کائنات میں
ذرّہ، کپاس، آئنہ، پتھر ہے زندگی

آخر یہ زندگی ہے، المناک ہو تو کیا
اک موت سے تو پھر بھی یہ بہتر ہے زندگی

اب تک تو تم نے دیکھ لی جو دیکھ لی مگر
اک بار پھر سے دیکھو حسیں تر ہے زندگی

آساں نہیں دنوں میں بدل دینا زیست کو
صدیوں سے اک مزاج کا مظہر ہے زندگی

وہ تیرگی میں ڈھونڈ ہی لیتی ہے راستہ
مہتاب کی طرح جو منور ہے زندگی

کیوں یارؔ یہ نگاہِ تغافل کا ہے شکار
ہر ایک شے کا مرکز و محور ہے زندگی

سہیل یار

غزل

اب تو بس یہ کمائیاں ہوں گی
ہر جگہ خود ستائیاں ہوں گی

آج محفل میں جا نہیں پایا
آج میری بُرائیاں ہوں گی

اِس وبا کو تو ختم ہونے دو
ہر طرف رُونمائیاں ہوں گی

ایسے جانے سے، اے مِری ہمدم!
سوچ لے، جگ ہنسائیاں ہوں گی

سوچ کر ہی یہ جان جاتی ہے
کتنی لمبی جدائیاں ہوں گی

سردیاں آ گئی ہیں اب جانم!
خشک میوے، رضائیاں ہوں گی

اِس بڑھاپے میں، ایسے موسم میں
درد ہوں گے، دوائیاں ہوں گی

کوند جائے گی ایک بجلی سی
ہاتھوں میں جب کلائیاں ہوں گی

اِک طرف سے شکائتیں، شکوے
اِک طرف سے صفائیاں ہوں گی

ظلم تیرا رہا اگر جاری
ہر طرف پھر دُہائیاں ہوں گی

اِس نے کی گر تِری طرف داری
میری دل سے لڑائیاں ہوں گی

حسرتوں کی سنیں گے سب چیخیں
دل میں جس دن کُھدائیاں ہوں گی

اِک خدائی کو مانتے تھے ہم
کیا خبر تھی، خدائیاں ہوں گی

اِس طرف تو ضیاؔ وفا ہی ہے
اُس طرف کج ادائیاں ہوں گی

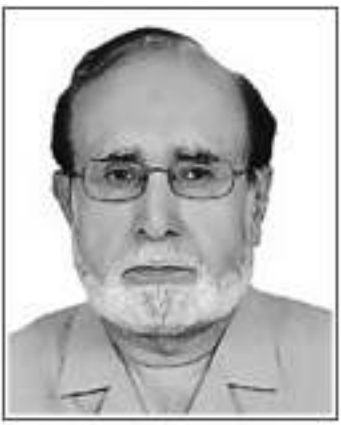

سید ضیا حسین

غزل

درد دل ہم کو ستاتا ہے بہت راتوں میں
چین پڑتا ہے کہاں پیار کی برساتوں میں

ہم بھلا تیرے خدو خال کہاں دیکھتے ہیں
ہم تو کھو جاتے ہیں اے شخص! تری باتوں میں

سانحہ کوئی ہمیں تاک نہیں سکتا ہے
ہم ہیں محفوظ محبت کے حسیں ہاتھوں میں

اور تو کچھ نہیں درکار ہمیں ،کچھ بھی نہیں
بے وفا!! ہم کو وفا چاہیے سوغاتوں میں

جانے کیا دل میں سمایا تھا کہ خالص سونا
کھوجتے رہتے ہیں ہم خام سی کچھ دھاتوں میں

تیر غیروں کے بھلا مجھ کو لگے ہی کب تھے
اپنے کچھ خاص ہی بیٹھے تھے مری گھاتوں میں

سطر در سطر، جیا! درج محبت ہو گی
اور کیا ہو گا بھلا اپنے بہی کھاتوں میں

جیا قریشی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

عمر بھر دکھ رگوں میں بھرتا ہے
جان لے کر ہی دل ٹھہرتا ہے

غزل

رنگ آنکھوں سے بھی لگتا ہے نیا ہو جیسے
دل کی دھڑکن نے کوئی ساز بنا ہو جیسے

اس کی آنکھوں میں تھے پیغام ہزاروں لیکن
تیری خاطر تھا جو روشن وہ جدا ہو جیسے

اب تو بس یاد ہے اتنا ہی تعارف اس سے
کوئی رستے میں اچانک ہی ملا ہو جیسے

اس کی جھپکن میں مرا نام تھا میں چونک گیا
مجھ کو لگتا تھا کہ ہر شے نے سنا ہو جیسے

تم مرا حال سنو گے تو پریشاں ہو گے
اجڑی قبروں سے دیا ٹوٹا ملا ہو جیسے

اس کا میں نام جو دہراؤں بھلا لگتا ہے
نام اس کا یہ فرشتوں نے رکھا ہو جیسے

اب اندھیروں میں بھی چلنے کا میں عادی ہوں شہاب
میرے اس دل میں محبت کا دیا ہو جیسے

شہاب اللہ شہاب

غزلیں

محبت استعارہ ہے زمیں کا
فقیروں کی قبا بھی ہے بگولہ
ترا چہرہ ستارا ہے زمیں کا
بگولہ بھی غبارا ہے زمیں کا

پہاڑوں سے کبھی راتوں کو دیکھو
سبھی سامان چھوڑے جا رہا ہوں
فلک جیسا نظارا ہے زمیں کا
سفر کوئی دوبارا ہے زمیں کا

جو ہم مٹی میں آنسو بو رہے ہیں
کوئی قرضہ اتارا ہے زمیں کا

سرفراز تبسم

دن میں آنے والے خواب
راہ بھلانے والے خواب

باغوں کی محرابوں میں
خوشبوؤں کے صفحوں پر
دیئے جلانے والے خواب
نقش بنانے والے خواب

مجھ کو آتے رہتے ہیں
بھید سے گہرے ہوتے ہیں
اُسے دکھانے والے خواب
خواب میں آنے والے خواب

غزل

سکوں محال ہوا اور قیاس بڑھنے لگے
سو میرے چاروں طرف بدحواس بڑھنے لگے

اب اس لیے بھی وفائیں سمجھ سے باہر ہیں
بہت سے لوگ مرے آس پاس بڑھنے لگے

فضا کچھ ایسی بنی رات خواب گہ میں مری
ہوا کے شور سے خوف و ہراس بڑھنے لگے

میں خود پہ روتا ہوں کھل کر نہ کھل کے ہنستا ہوں
مجھے یہ ڈر ہے مرے غم شناس بڑھنے لگے

بہت محال ہے جینا ، کٹھن رویوں میں
خود اپنے آپ پہ دل کی بھڑاس بڑھنے لگے

تمھارے ہاتھ کا پانی بھی شہد جیسا ہے
تمھارا ہاتھ لگے اور مٹھاس بڑھنے لگے

ہمارے جسم امانت ہیں کچی قبروں کے
ہماری یاد میں ساجد اداس بڑھنے لگے

ساجد رضا خان

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

کوئی پوچھے تو کہیں غیر تھا یا اپنا تھا
ایک چہرے کے سوا شہر میں کیا اپنا تھا

غزل

اس لیے شہر کا ہر شخص نہیں ہے تیرا
تخت میرا ہے مگر تخت نشیں ہے تیرا

جب ترے پاؤں میں صحرا کی مسافت بھی ہے
کیوں سفر سے پلٹ آنے پہ یقیں ہے تیرا

ہم بھی رکھتے ہیں کئی چاند سے چہرے لیکن
سب کے یاروں سے مگر یار حسیں ہے تیرا

کیا ہوا ، اُس نے اگر چھوڑ دیا ہے تجھ کو
ایک ہی شخص تو محبوب نہیں ہے تیرا

تجھ میں یہ کفر کے انداز کہاں سے آئے
ورنہ گھر بار تو مسجد سے قریں ہے تیرا

میں نے خود غیر کے پہلو میں اُسے دیکھا ہے
تُو سمجھتا ہے کہ وہ زہرہ جبیں ہے تیرا

ازور شیرازی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

رقص شعار ہو گئے ، رزقِ مدار ہو گئے
ہم تو فقط حصار تھے ، مرکزۂ ثبات کے

غزلیں

مسافتوں میں عجب سلسلہ رہا
وہ روبرو تھا مگر فاصلہ رہا

تری طلب مری منزل بنی رہی
مرا عدو مرے اندر چھپا رہا

جو ان کے سامنے میں کہہ نہیں سکا
مرے سخن میں وہی گونجتا رہا

جو زخم دل پہ لگا وہ بھرا نہیں
جو دکھ ملا وہ سدا، لا دوا رہا

میں گھوم گھام اسی در پہ آ گیا
مرے لیے جو ہمیشہ کھلا رہا

تری نگاہ یہ لب اور سخن حبیب!
میں خواب خواب تجھے دیکھتا رہا

بشیر احمد حبیب

چاہتیں جذب دروں مانگتی ہیں
سر پھری ہوں تو جنوں مانگتی ہیں

دھڑکنیں اپنی روانی کے لیے
تیرے لہجے کا سکوں مانگتی ہیں

اس جنم میں تجھے پانے کے لیے
قسمتیں کن فیکوں مانگتی ہیں

میری باتیں بھی معانی کے لیے
تیری آنکھوں کا فسوں مانگتی ہیں

حرف اَسرار کو پانے کے لیے
حیرتیں سوز دروں مانگتی ہیں

غزل

جب دن نکل رہا ہے تو کیوں رات کا ہے خوف
دن بھی نہ رات جیسا ہو اس بات کا ہے خوف

تاریکیوں میں چلتے رہے دیکھ بھال کر
جو دن میں رات گذری ہے اُس رات کا ہے خوف

سب کو یہاں پہ خوف اندھیروں کا ہے مگر
میں روشنی سے ہارا ہوں اِس مات کا ہے خوف

مجھ کو پتہ ہے کیا ہیں اندھیرے، اُجالے کیا
کس سے نبھا ہو کیسے یہ حالات کا ہے خوف

شکیل قمر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

آج دل کی وہ چھب ، وہ دھج نہ سہی
ہجر میں داغ دار سا ، کچھ ہے

غزل

جان دینی تھی مگر جان نہیں دے پایا
اپنے ہونے کا میں تاوان نہیں دے پایا

ترے عشاق میں گمنام اگر ہوں تو سبب
دل تجھے میں علی الاعلان نہیں دے پایا

خون سے اپنے رقم کی ہے جو دیواروں پر
اس کہانی کو میں عنوان نہیں دے پایا

وقت بزدل نے مری پیٹھ میں خنجر گھونپا
موت مجھ کو مرے شایان نہیں دے پایا

خود کو بھی لے کے نکلنا تھا مجھے گھر سے مگر
اتنی مہلت تھی کہ میں دھیان نہیں دے پایا

اعجاز حسین فاخر

جس محبت سے اسے خلق کیا تھا رب نے
وہ محبت اُسے انسان نہیں دے پایا

اس کی جھولی میں کئی میں نے مواقع ڈالے
پھر بھی دشمن مجھے نقصان نہیں دے پایا

جتنی ہنگامۂ دنیا سے ملی ہے فاخر
اتنی وحشت مجھے زندان نہیں دے پایا

غزل

وہ میں نہیں تھا ، مگر وہ میری ہی ذات سمجھے
عجیب تھے لوگ وہ بھی جو دِن کو رات سمجھے

ہو مُلک پر جب امیر زادے کی حُکمرانی
غریب لوگوں کی کیسے وہ مُشکلات سمجھے

خدا کے بارے میں بُت پرستوں سے بات کی تو
کبھی وہ عُزّیٰ ، کبھی وہ لات و منات سمجھے

ابھی وہ غُصّے میں ہے ، ابھی تُم خموش بیٹھو
نہیں یہ مُمکِن ابھی تُمھاری وہ بات سمجھے

میں دوستوں کی مدد کو بیٹھا تھا کیفی لیکن
وہ میرے چُھپ بیٹھنے کو دُشمن کی گھات سمجھے

محمود کیفی

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

اک درد بھی رکھا نہ ہتھیلی پہ کسی نے
کیا ہم کو دیا صنعتِ دویوزہ گری نے

غزلیں

دن ہو یا رات ہو بے وجہ پریشاں رہنا
اِتنا اچھا بھی نہیں خُود سے گریزاں رہنا

جب اُسے دیکھنا تو دیکھتے رہنا لیکن
جب اُسے سوچنا تو اور پریشاں رہنا

اُس کو آنکھوں میں سجانا تو اُجالے رکھنا
اُس کو خوابوں میں بسانا تو غزل خواں رہنا

چاہتا ہُوں مرے مالک یہ بتا دے مُجھ کو
کب تلک ہے مری قسمت میں بیاباں رہنا

آسرا تیرے سِوا کوئی نہیں ہے میرا
میری ہر شے کا سدا تُو ہی نگہباں رہنا

جن سے ملنے کی بڑی آس لگی رہتی ہے
اُن کے ملنے کے لیے سوچ میں غلطاں رہنا

جانے کس طرح کی پائی ہے طبیعت قائل
اُس کی قُربت میں جو رہنا تو ہراساں رہنا

عمر قیاز قائل

یقین ہے نہ گماں ہے نہ اعتبار سا ہے
کسی کے لوٹنے کا پھر بھی انتظار سا ہے

بجھا لوں دیکھ کے اُس کو میں تشنگی اپنی
اِک اجنبی کہ جو تصویرِ آبشار سا ہے

اُتار دُوں گا اگر زِندگی نے ساتھ دیا
کہ دوستوں کا مرے سر پہ کچھ اُدھار سا ہے

چمن میں پُھول کھلے ہیں تو یہ گماں گزرا
خیالِ یار کا چہرہ بھری بہار سا ہے

کئی دِنوں سے وہ مُجھ کو نظر نہیں آئے
دِل و نگاہ پہ یہ کیسا اختیار سا ہے

وہ زِندگی میں بہت کم مِلا ہے مُجھ سے مگر
اِک اجنبی کہ جو خُود بھی سدا بہار سا ہے

وہ آ کے جھونکے کی صُورت پلٹ گیا قائل
کہ جس کے واسطے دِل میرا بے قرار سا ہے

غزلیں

بے رخی اپنی پہ اب آنسو بہانا ہے عبث
اب مری میت پہ جانم تیرا آنا ہے عبث

بھر چکی ہے دل کی نگری رنجِ جاناں سے مری
اے غمِ دوراں مرے من میں سمانا ہے عبث

چل رہی ہے چار سو بے اعتباری کی ہوا
اس زمانے میں کسی کو آزمانا ہے عبث

ڈوبنا جو چاہتے ہیں بالارادہ خود بہ خود
ناخدا پھر ان کی کشتی کو بچانا ہے عبث

بات ہوتی ہے میاں اپنے نصیبوں کی سدا
بغض و کینہ پال کے دل کو جلانا ہے عبث

کوہ و صحرا سے نہیں گزرے جو تیرا کارواں
دل میں منزل کا تصور تک بھی لانا ہے عبث

اب بنا پھرتا ہے ہر اک فرد اپنا رہنما
اب خضر کو ڈھونڈ کر ہادی بنانا ہے عبث

سید بادشاہ جلالی

بڑے اسی کو ہی کہتے ہیں دل لگی مرے دوست
کسی سے کچھ بھی نہ کہنا ہے زندگی مرے دوست

جہاں میں ایک بھی ایسا نظر نہیں آیا
کرے جو آ کے تمہاری برابری مرے دوست

بتا رہی ہیں مہکتی فضائیں گلیوں کی
گذر ہوا ہے تمہارا ابھی ابھی مرے دوست

میں اک وظیفہ تمہیں دان کرنے والا ہوں
کشید کرنا اندھیروں سے روشنی مرے دوست

اسد رضا سحر

غزل

وجودِ شب پہ کوئی آن بان چھوڑ گیا
اجاڑ بستی میں جلتا مکان چھوڑ گیا

خود اپنی سوچ بھی مجھ کو پرائی لگنے لگی
وہ میرے دھیان میں ایسا گمان چھوڑ گیا

ہوائے جبر نہ بدلی کبھی زمانے میں
ضمیر، عدل کا خستہ مکان چھوڑ گیا

ستم ظریف مسافر وفا کی منزل کا
انا کے دوش پہ الجھی تکان چھوڑ گیا

کمال فن تھا جسے یاریاں نبھانے میں
وجودِ ہست کی تنہا دکان چھوڑ گیا

یہ کون لوگ ہیں جو ہار کر بھی جیتے ہیں
سوال، ذہن میں اک داستان چھوڑ گیا

یہ حال بارہا ساجد ہوا غریبی میں
زمیں پرائی ہوئی، آسمان چھوڑ گیا

سجاد حسین ساجد

غزلیں

دھوپ یادوں کی اگر برسے تو چھایا کرتے
سارے لمحے تری فرقت کے منایا کرتے

قید میں دن ہے اگر اجلے ہوئے چہرے کا
رات آنکھوں کی بھی پردے میں چھپایا کرتے

سوگ ہوتا ہے نگاہوں میں چھپا کر لیکن
شامِ فرقت میں وہ یادوں کو ہیں گایا کرتے

بات کرنے کی بھی فرصت نہ تھی جن کو اب تک
شہرِ خاموش میں پلکیں ہیں جلایا کرتے

پیڑ سوکھے ہوئے پتوں سے یہ کہتے ہیں شمس
لوگ گل کو ہی ہیں آنکھوں سے لگایا کرتے

آفتاب محمود شمس

نکل کے دل سے آ گئے ہیں کس عجب دیار میں
دکھائی دے نہیں رہا کسی کو کچھ غبار میں

خدا براجمان ہے کسی بڑے سے میز پر
ہمیں بھی اس نے سامنے رکھا ہے گول جار میں

مرے بغیر راستہ کٹے گا کس طرح بھلا
تو رخ بدل کے رک گیا ہے کس کے انتظار میں

مری طرح کا کوئی شخص مجھ کو مل نہیں رہا
لگا دیا ہے تو نے مجھ کو کس عجب قطار میں

تمھاری آنکھ کا نشہ دماغ سے گیا نہیں
گھرا ہوا ہوں آج تک خمارِ بے شمار میں

صائم شیرازی

غزلیں

غرور زاد ہواؤں کے رنگ اڑنے لگے
بلا کے حبس میں جیسے پتنگ اڑنے لگے

فقیر وجد میں کانٹوں پہ رقص کرنے لگا
تو دھول ہو کے سبھی خار و سنگ اڑنے لگے

اُدھر سفر کا ارادہ کرے کوئی دل میں
اِدھر مزار کے تالوں سے زنگ اڑنے لگے

مری دھمال کی لے میں سُروں کے ساز ملا
سرود بجنے لگے جلترنگ اڑنے لگے

رمیضؔ اس کے تغافل کا اتنا فائدہ ہو
ہمارے دل میں چھپی ہر امنگ اڑنے لگے

رمیض نقوی

بہت خموش ہو، ہم سے کوئی سوال کرو
ہمارے حال پہ تم سربسر ملال کرو

عجیب خواب نے چونکا دیا تھا رات مجھے
خدا کے واسطے اب میری دیکھ بھال کرو

وفا کہ نام پہ سر دے دیا ہے ہم نے تو
مزا تو جب ہے کہ تم بھی کوئی کمال کرو

ہمارے زخم تمھیں کیوں کھٹکتے رہتے ہیں
تم اپنے خواب سجاؤ، سخن جمال کرو

وہ جس کو جانا تھا وہ کب کا جا چکا ہے زین
تم اس کے واسطے اب خود کو مت نڈھال کرو

زین علی رضوی

غزل

فصیلِ ضبط سے ٹکرا کے سر ہی پھوڑے گی
تری صدا جو مرے رُخ سے منہ نہ موڑے گی

ابھی تو وقت کو تاوان دے کے بیٹھا ہوں
ابھی حیات مرا ساتھ کیسے چھوڑے گی

مَیں ایک عمر سے بیٹھا ہوں کوہِ فرقت پر
صدائے ربط کسی دن تو آ جھنجھوڑے گی

بطونِ سنگ سے خوشبو نچوڑنے کی روش
مجھے خبر ہے، کہیں کا نہ مجھ کو چھوڑے گی

یہ سادہ کاریِ فطرت، یہ مصلحت کوشی
مری رگوں سے کہاں تک لہو نچوڑے گی

نوید وقت سے پہلے ہی چل پڑوں گھر سے!
تھکن سفر کی مرے حوصلے نہ توڑے گی؟

نوید صادق

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

دکھ انگور کی بیلیں ہیں یہ بیلیں پھلنے دو
سکھ کے پل بھی کھنچ آئیں گے، سورج ڈھلنے دو

جو درد تو نے میرے کلیجے میں رکھ دیا

شاعرِ امروز

ماریہ محور

شاہد مالکی

شاعری عمومی طور پر تین حالتوں میں لکھی جاتی ہے - قبل از وحشت، دورانِ وحشت اور بعد از وحشت- ماریہ محور کی شاعری وحشت کے دوران لکھی گئی شاعری ہے- یہ اضطراب و اضطرار کے دوران تحریر ہونے والی شاعری ہے - حواس سُن کر دینے والے صدماتی لمحوں کے دوران تخلیق پانے والی شاعری ہے- یہ حیرت سے کئی قدم آگے سکتے کی حالت میں جنم لینے والی شاعری ہے- کومے میں چلے جانے والے شخص کی آنکھ سے نکلنے والے آنسو کے عرصہ انتظار کے دوران قلم بند ہونے والی شاعری ہے- دنیا اور دنیا کے سسٹم پہ ایک طویل احتجاجی چیخ کے دوران وجود پانے والی شاعری ہے- اگر آپ شاعری کو لطف، مسرت اور تسکین دینے والی کوئی چیز سمجھتے ہیں تو ماریہ محور کی شاعری آپ کے لیے ہرگز نہیں ہے اور آپ ہرگز اس شاعری کے قاری نہیں ہیں- یہ دل دہلا دینے والی شاعری ہے- شدید سکتے اور شدید وحشت سے دوچار کر دینے والی شاعری ہے- کسی الارمنگ صورتِ حال کی تشویش ناکی میں مبتلا کر دینے والی شاعری ہے-

ماریہ محور - 3 اگست 2001ء کو کراچی میں پیدا ہوئیں- کمپیوٹر سائنس میں تھرڈ ائیر کی طالبہ ہیں- 2018ء کے اواخر میں لکھنا شروع کیا- ذیل میں ان کا مختصر سا شعری انتخاب:

طویل چپ سے بناتے ہیں رات بھر خود کو
پھر ایک چیخ سے خود کو مٹا کے روتے ہیں

اسے کہو کہ سماعت بدل گئی میری
یہ قہقہے مجھے نوحہ سنائی دیتے ہیں

شاید کہ اب کی بار کوئی رابطہ نہ ہو
شاید کہ اب کی بار تمھیں اک خبر ملے

جو درد تو نے میرے کلیجے میں رکھ دیا
اُس دردِ التفات سے خالی ہے کائنات

وہ مجھے چھوڑ کر گیا کیوں ہے
وہ مجھے مار بھی تو سکتا تھا

دل کا ماتم دماغ میں جب ہو
یار بس ایک رگ ہی پھٹتی ہے

آیتِ صبر گھول کر پی لو
اب مرا لوٹنا نہیں ممکن

جن کو جینا عزیز ہے مولا
ان کو عمریں ہماری لگ جائیں

دل کو رونے سے لاکھ بہتر ہے
پھٹ گیا ہے تو سی لیا جائے

مکرر کی صدائیں سن رہے ہو
مرے ہر غم پہ یعنی داد ہو گی

عین ممکن ہے رات مر جائیں
صبح کے انتظار میں ہم لوگ

اپنے ہونے پہ رات بھر چیخوں
اپنے ہونے پہ گاؤں وحشت میں

جی میں آتا ہے بے ضرر چیخوں
اور بولوں ترے جہان پہ تف

خدا کرے کہ تمھارے لبوں تلک پہنچے
وہ قہقہہ جو اداسی کے وقت لگتا ہے

جس میں ٹانکے لگ جائیں گے
دل ہے کوئی دھات نہیں ہے

ہم باغِ محبت کو سجانے میں لگے ہیں
اور لوگ یہاں پھول چرانے میں لگے ہیں

جو لوگ خدا کو بھی خدا تک نہیں کہتے
وہ لوگ خدا خود کو بنانے میں لگے ہیں

لگتے رہتے ہیں داغ تہمت کے
کتنا اچھا ہے پارسا ہونا

☆☆☆☆☆

ترکیب ساز شاعر

شاعرِ امروز

احمد رضا

شاہد ماکلی

احمد رضا کی غزلیات کا مطالعہ کیا جائے تو اتنی کم عمری میں ان کی فنی اور موضوعاتی پختگی اور صلاحیت دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔ اس پر مستزاد یہ کہ انھیں ترکیب سازی میں خاص ملکہ حاصل ہے۔ مثلاً چند اضافتی تراکیب دیکھیں؛ راہیء جادہء بیضا، شاخِ گلِ اندوہ، گلیمِ زرد، شکستِ کاہ، یک جامہء فرقت، سنگِ اعتباہ، بافندہء ہجراں، پیمانہء سرشار، عصرِ سبک پا، موجِ کشاکش، عقدہِ ماتم وطرب، بندِ قبائے شب، بہرِ تماشائے دگر، ہوائے شادمانی وغیرہ۔ بعض تراکیب ایسی ہیں جن کے پس منظر میں نَو بہ نَو پیکر بھی لَو دیتے نظر آتے ہیں۔ تراکیب سازی کا غالب رجحان ان کے وسیع المطالعہ ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ افضال احمد سیّد کے اساطیری اسلوب کی انعکاس پذیری ان کے ہاں کہیں کہیں ملتی تو ہے مگر وہ بخوبی جانتے ہیں کہ کسی بھی متاثر کُن پیشرو کا اسلوبی نقطہء عروج بعد والوں کا نقطہء آغاز ہونا چاہیے۔ امید رکھنی چاہیے کہ اپنے الگ طرز احساس اور جدید حسیت دانی کی بنا پر وہ بہت جلد اپنا ایک منفرد، متوازن اور مستحکم اسلوب دریافت کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ ہاں، البتہ سیّدہ پروین شاکر کے حسیاتی وفور کی شدت کا انجذاب ان کے ہاں بڑھ بھی جائے تو یہ کوئی پریشان کُن بات نہیں ہو گی بلکہ اس سے ان کی غزل مزید جمالیاتی تاثیریت سے مالا مال ہو جائے گی۔

احمد رضا۔ 7 مارچ 2002ء کو گجرات میں پیدا ہوئے۔ حافظِ قرآن ہیں۔ اِن دنوں پروفیشنلز اکیڈمی آف کامرس لاہور سے سی اے کر رہے ہیں۔ ذیل میں کچھ منتخب اشعار:

گلیم زرد جو اوڑھی تو اشتباہ ہوا
عبث، مَیں غازۂ گل سے شکستِ کاہ ہوا

یہ لیلِ سرد و معصیت چہار سو، اور مَیں
چراغ خفتہ جلایا تو بے پناہ ہوا

شمیم و شبنم و شورش رہیں گے گل سے جدا
ربیع رُت پہ سبک سنگِ اشتباہ ہوا

....

بافندۂ ہجراں نے بُنا رختِ سیہ فام
یک جامۂ فرقت مجھے بیگار میں آیا

شاخِ گلِ اندوہ سے ناگاہ گرا میں
اور پھر ترے پیمانۂ سرشار میں آیا

....

عجیب موجِ کشاکش تھی میرے چاروں طرف
مگر میں دامن و اندام و دل بچا لایا

....

روشنی ہونے لگی اپنے مضافات میں ضم
میں نے لَو پر جو کبھی دیدۂ حیراں رکھا

میری بینائی بھی اس روز ہوئی تھی معدوم
اس نے جس روز ستارہ سرِ مژگاں رکھا

آخرش وہ بھی مری ذات سے ششدر نکلا
جس نے برسوں مجھے انگشت بدنداں رکھا

....

بغیر رقص کیے خاک کو اڑاتا گیا
یقین طاق میں رکھ کر گماں نبھاتا گیا

جو غم ملے تھے مجھے وہ تو میرے تھے ہی نہیں
یہ میرا ظرف تھا چپ چاپ بوجھ اٹھاتا گیا

....

جو ساحل پر کھڑے گھبرا رہے تھے
انہیں پانی میں پھینکا جا رہا تھا

تجلّی دور ہوتی جا رہی تھی
مرا پیکر بکھرتا جا رہا تھا

وہی کوزہ تھا سب سے بیش قیمت
جو عجلت میں بنایا جا رہا تھا

سمے کی باگ پکڑی جا رہی تھی
کوئی سُو معلّیٰ جا رہا تھا

شجر کی ٹہنیوں کا کھوکھلا پن
پرندوں سے چھپایا جا رہا تھا

جو نو آموز عاشق تھے انہیں کل
مرا قصہ سنایا جا رہا تھا

بگڑتا قیس کا بنتا تھا اس پر
رضا کو دشت سونپا جا رہا تھا

....

تینِ اکناف کے الجھاؤ سے
دفعتاً عصرِ تنگ پا نکلا

وہ سیاہ ابنِ سیاہ ابنِ سیاہ
راہیِ جادۂ بیضا نکلا

کچھ نے تاروں کو گنا، کچھ نے گگن ماپ لیے
ہائے اس شب نے تو کتنوں کے ہنر بھانپ لیے

.....

پیڑ اداسی کا خزاں دیدہ ہوا جاتا تھا
میں نے پھر سینچ دیا بہرِ تماشا دگر

.....

تیری غیبت کا یہ نتیجہ ہے
میری خلوت کا انجمن ہونا

.....

مرے بنائے ہوئے کوزے کب سمجھتے ہیں
میں خاک ہوتا رہا چاک کو گھماتے ہوئے

.....

پاس اتنا تو آؤ نا کہ تمھیں
مری سب دھڑکنیں سنائی دیں

ملتمس ہوں میں چند یادوں سے
اب خدارا مجھے رہائی دیں

.....

خط پڑھا کل آپ کا تو ابتدا کچھ یوں ہوئی
"یہ تمھارے نام میری آخری تحریر ہے"

پھر سے ٹوٹے گا بھروسہ مرگ کی دہلیز پر
آج پھر ساحل پہ اک مٹی کا گھر تعمیر ہے

.....

آپ آئے ہیں اڑتے ہوئے جیسے کہ ہَوا ہوں
اور ہم ہیں کہ ژولیدہ مُو، بیمار پڑے ہیں

اُس در پہ پہنچنے کا ارادہ تو کرو تم
دل میں جو محبت ہو تو اسباب بڑے ہیں

آئینۂ دل میں جو شفق پھول رہی ہے
یہ صبح ہوئی ہے؟ نہیں خورشید ڈھلے ہیں!

یکدم دلِ نالندہ مرا گُنگ ہوا ہے
کس نے مری آنکھوں پہ رضا ہاتھ دھرے ہیں

.....

آئینے اور مجھ میں جو رشتہ تھا کٹ گیا
سو عکس میرا مجھ سے ہی آ کر لپٹ گیا

آسیب اتنے مجھ میں رہائش پذیر ہیں
مُجھ بَن میں جو بھی آیا، ڈرا، اور پلٹ گیا

ہم لوگ منزلوں پہ پہنچتے تو کس طرح
ہم وہ ہیں جن کے پاؤں سے رستہ لپٹ گیا

گہرا سکوت ٹوٹ گیا اُن کے درمیاں
جو رابطہ بحال تھا دونوں میں، کٹ گیا

.....

مسجود بن کے بیٹھے تھے ہم اور دفعتاً
گندم کی چاہ نے ہمیں ہرجائی کر دیا

☆☆☆☆☆

علی اصغر عباس / پیاس ہی پیاس

معزز خواتین وحضرات!

مقتل ادب میں زندہ وسلامت 44 سال بسر کرنے کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ ادب کی بہت سی اچھی اور اعلیٰ تخلیقات صرف محمد جمیل اکادمی والے کی وجہ سے قارئین اور سامعین تک نہیں پہنچ سکیں، کہ یہ صاحب ہر تقریب کو اپنی شاعری کی طرح ڈیل کرتے ہیں اور اپنی اس ڈیل کو ڈھیل میں بدلتے چلے جاتے ہیں اور ہر تقریب کی اطلاع صرف ایک رات پہلے دیتے ہیں کہ شاعر ادیب کی وہی رات کام کی ہوتی ہے جو جمیلی اطلاع کے بعد ناکام ہو جاتی ہے اُسی ناکامیِ شب کے صدمے سے نڈھال اکثر شاعر ادیب تقریب میں شرکت سے پرہیز کرتے ہیں کہ جمیل کے فون نے اُن کے جن سرکشیدہ جذبات کو مجروح کیا تھا، ان کو ازسرنو ڈویلپمنٹ کرسکیں۔ خیر محمد جمیل اور اکادمی ادبیات کا قصیدہ تو میں ہر تقریب میں پڑھتا ہوں، مگر یہ میرا یار جمیل مستانہ وار اس سارے قصیدے کو سناتا ہے اور ہنسی میں اڑا دیتا ہے مجھے یقین ہے کہ یہ اپنی ریٹائرمنٹ کی تقریب کا بھی یہ ہی حال کرے گا اور پھر ہنستے ہوئے کہے گا جی جی جی، میں تے مذاق کیتا سی قبلہ جمیل صاحب آپ مذاق کریں، اور ضرور کریں مگر میں آج مذاق نہیں کروں گا کیونکہ علی اصغر عباس کوئی معمولی شخص نہیں، نہ ہی یہ شارٹ کٹ مار کر ادب میں آیا ہے اس شخص نے ادب کو تقریباً 50 سال دیئے ہیں اور ان پچاس سال کے عرصے میں مکمل طور پر حسن سلوک، باوقار اور باوزن اشعار اور نیک اعمال کا ایک بڑا ذخیرہ قارئین ادب کی نذر کیا ہے۔

جبکہ اس جیسا خوبصورت اور وضع دار شخص اگر پشاور میں رہتے ہوئے بے وزن شاعری بھی

اعجاز رضوی

کرتا تب بھی کروڑ پتی ہوتا مگر اس نے کروڑ پتی بننے سے زیادہ سیدھا سادہ شاعر ہی بننا پسند کیا اور خوب شعر کہے۔ علی اصغر عباس نے اسٹیٹ بینک آف پاکستان سے ملازمت کا آغاز کیا اور وہیں سے ریٹائرمنٹ لی۔ جبکہ درمیان میں بہت سے اخبارات میں کالم لکھے رسالے نکالے بہت سے ایڈیٹر حضرات کے نام سے اداریے لکھے، مگر اس کی جیب ہمیشہ خالی رہی۔

اور اس خالی جیب کا اسے ذرا بھی دکھ نہیں ہے کہ یہ ایک بینکر ہے اور جیب میں رقم رکھنے کے بجائے بینک اکاؤنٹ میں رقم رکھنے کو پسند کرتا ہے، یہ بینکر ہے اس لیے کبھی بھی پیسے کی کمی کا شکار نہیں ہوتا۔ یوں بھی جب بھی اس کی ہتھیلی میں کھجلی ہوتی ہے یہ فوراً اپنے کسی دوست سے پیسے مانگ لیتا ہے، یہ ہاتھ اور مزاج کا اتنا کھلا ہے کہ اگر اسکو پانچ لاکھ روپے دے دیے جائیں تو یہ فوراً، دوستوں کی دعوت کا اعلان کر دیتا ہے اور جلدی سے اڑھائی لاکھ کے کریلے اور اڑھائی لاکھ کا قیمہ خرید کر مزیدار دیگیں پکوا لیتا ہے اور روٹیوں کے لیے پھر کسی دوست سے پیسے ادھار مانگ لیتا ہے۔ یہ پہلے موٹر سائیکل پر سفر کرتا تھا مگر وہاں تک جہاں تک کوئی دوسرا موٹر سائیکل سوار اس کو لفٹ نہیں دیتا، اس نے گاڑی خریدی تو اس میں اس لیے سفر نہیں کیا کہ اس میں پٹرول پلے سے ڈلوانا پڑے گا جن دنوں یہ گھٹنوں کے درد میں مبتلا نہیں تھا ان دنوں یہ بھاگتے دوڑتے شاعری کرتا تھا اور ہر شعر پر خود ہی واہ کہا کرتا تھا مگر اب ہر شعر پر آہ کہتا ہے۔

ایم اے او کالج کے قریب کینٹین ہو یا پیشل ٹاؤن میں کوئی ہوٹل، راج گڑھ ہو یا ٹی ہاؤس یا کوئی اور جگہ ہر طرف ہر جگہ نظر آتا تھا، مگر شرط بس ایک ہی تھی کہ وہاں ناہید شاہد، عارف محمود، جاوید انور، نجیب احمد، خالد احمد، احمد راہی، طارق زیدی موجود ہوں، اور چائے چل رہی ہو بلکہ دوڑ رہی ہو۔

کیا خوبصورت زمانہ تھا، ٹی ہاؤس / فنون کا دفتر، کچہری چوک سانده روڈ اور ایم اے او کالج کی طرف آتے جاتے شاعر ادیب اور ہنستا گاتا ادب، گھر چلے جاؤ، بچوں کو سلا کر پھر آ جاؤ پھر چلے جاؤ، بیگم کو سلا کر پھر آ جاؤ، نہ کوئی جلدی نہ کوئی مجبوری، انھیں دنوں میں علی اصغر عباس نے اپنا مجموعہ کلام مرتب کیا، اور نام رکھا، خواب زاد، یہ جنوری 1992 کا ذکر ہے، اس مجموعے کلام کو جنگ پبلشرز نے بہت اہتمام سے شائع کیا۔

اس کتاب پر اختر حسین جعفری، انجم رومانی کا فلیپ موجود تھا دیباچہ طارق زیدی نے لکھا تھا ان دنوں جو خوشی منائی گئی وہ بھی خوب تھی ہر شخص علی اصغر عباس کو مبارکباد دیتا اور اسی کے اشعار سناتا کہ:

زندگی گزار دی ایک خواب دیکھتے
دشت پار کر گئے ہم سراب دیکھتے

انتظارِ ماہ میں جھیل ریت ہو گئی
ورنہ ہم بھی چاند کو زیرِ آب دیکھتے

انھیں دنوں اس کی نظموں نے بھی خوب شہرت پائی، طویل ترین مضمون کو مختصر ترین نظم میں بیان کرنے کا ہنر صرف علی اصغر عباس کے پاس تھا، اس نے نظم لکھی:

بارش، ریت گھروندے تیرا کیا لیتے ہیں
بارش اڑھیا کے چولہے کی آگ سے کیوں جلتی ہے

.....

خواب زاد کی شاعری راتوں رات سفر کرتی ہوئی صبح مجلس ترقی احمد ندیم قاسمی کے پاس پہنچ جاتی، وہاں سے شام کو 'فنون' کے دفتر پہنچ جاتی، پھر رات کو پرانی انارکلی اور پھجی چوک پہنچ کر دم لیتی اور یہ سفر جاری رہتا۔ خواب زاد کے بعد 1999 میں اس کا مجموعہ کلام ہم لوگ مسافر ہیں شائع ہوا اگرچے دوستوں کی حوصلہ افزائی نے علی اصغر عباس کو ہمت دی تھی کہ یہ اپنا دوسرا مجموعہ کلام 1996 میں لے آتا، مگر کچھ ذاتی گھریلو مجبوری نے اس کو روکے رکھا اور یوں یہ مجموعہ کلام 1999 میں شائع ہوا، اس نے ہم لوگ مسافر ہیں کی شاعری سے بھی چونکایا اس نے کہا،

ہم بھی کھڑے ہیں دم بخود دشت طلب میں دیر سے
پھیلی ہوئی ہے چار سو دہشت ترے جمال کی

نخل وجود بھی کبھی سرسبز سایا دار تھا
برگ شباب لے اڑی آندھی یہ ماہ و سال کی

.....

ہم لوگ مسافر ہیں کے بعد، نعتیہ مجموعہ رحمت پروردگار، پھر دل آویز، شائع ہوئے علی اصغر عباس لکھ رہا ہے، لکھتا رہے گا، کہ اس میں لکھنے کی پیاس ہے یہ اچھے ادب کا شیدائی، اچھے شعر کا متوالا ہے، خود لکھتا ہے اور دوسروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے، کسی سے کالم لکھواتا ہے کسی سے شاعری کرواتا ہے، کسی کو کتابیں پڑھنے کی ترغیب دیتا ہے اور اچھی کتاب کی چوری کو کارِ ثواب سمجھتا ہے۔

علی اصغر عباس بہت زیادہ لکھتا ہے، مگر اس زیادہ لکھنے میں روزانہ لکھنا نہیں، بس موڈ بن گیا یا کوئی لہر متاثر کر گیا یا کوئی متاثر کر گئی تو لکھنے بیٹھ گیا، لکھنے بیٹھ گیا کسی کالم افسانہ یا کسی نثر پارے کے لیے کہہ سکتے ہیں مگر شاعری کے لیے لکھنے بیٹھ گیا والی بات کسی صورت بھی صادق نہیں آتی کہ شاعری کے لیے علی اصغر عباس کا سفر دو قدم چلنا یا پھر موٹر سائیکل کو کک لگانے سے پہلا گیئر میں ڈالنے تک ہے، مگر یہ بھی پرانی بات ہے، اب یہ اتنا آہستہ خرام ہو چکا ہے کہ اس کے چھوٹے چھوٹے نوامہ نواسی بھی اس کے ترلے کرتے ہیں کہ نانا ابو ذرا تیز چلیں، اپنی نئی نسل کا یہ مطالبہ سن کر یہ دونوں ہاتھ گھٹنوں پر رکھ کر بڑی حسرت سے کہتا ہے ہائے جوانی پھر خود ہی سیدھا کھڑا ہوتا ہے اور ادھر ادھر دیکھ کر ایک موٹی سی گالی بک کر کہتا ہے، بکواس بند کر، تو جوانی وچ کی پٹ لیا سی"

علی اصغر عباس جن دنوں سنت نگر میں رہتا تھا، یہ گھر کی کھڑکی سے سورج کی چال دیکھ کر گھر سے نکلتا تھا، جب تک سورج غروب کی پوزیشن نہ آ جائے یہ گھر سے باہر نہیں

نکلتا تھا، کیونکہ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے سارے کالے لوگ سورج کی وجہ سے کالے ہوئے ہیں اور وہ گورا چٹا رہنا چاہتا ہے یہ ٹی ہاؤس سے بھی جلد ہی گھر آ جاتا تھا، کے اس کا خیال تھا خوبصورت لوگوں پر جن عاشق ہو جاتے ہیں، یہ حلقہ ارباب ذوق کے الیکشن میں بھی کھڑا ہوا مگر اس خوف سے اندر ہی اندر بیٹھا رہا کہ الیکشن میں اتنے زیادہ کالے لوگ جمع ہو جاتے ہیں کہ بعد میں سب اس کو چٹا چٹا کہہ کر چھیڑنے لگتے ہیں۔

علی اصغر عباس نام سے شیعہ چہرے سے سنی اور حرکتوں سے وہابی لگتا ہے، جبکہ اس کا رہن سہن اور ملنا جلنا ایک پکے اور سچے قدیمی مسلمان والا ہے، ہنستے ہوئے بات کرنا، بات کے بعد قہقہہ لگانا، پھر دوسرے کو کافر سمجھتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ مارنا، اس کو دیگر مسلمانوں سے جدا کرتا ہے یہ مشاعروں میں کم اور لوگوں کے قلوں میں زیادہ شرکت ہے، کسی کو کچھ مالی فائدہ دینے سے زیادہ دعائیں دینے پر یقین رکھتا ہے اور اس پر عمل کرتا ہے، بھیک مانگنے والے فقیر کو بھی کچھ دینے کے بجائے دعائیں دیتا ہے، علی اصغر عباس کے دیگر برادران میں محترم نذیر ناجی اور جناب علی اکبر عباس صاحب اس کے مزاج سے سراسر مختلف ہیں جبکہ (مرحوم) بھائی رضا سہیل ان تینوں سے مختلف تھا علی اصغر عباس نے اپنے شعری مجموعے ہم لوگ مسافر ہیں، میں رضا سہیل کے لیے قریہ خواب کا مسافر کے عنوان سے دل میں اتر جانے والی نثر لکھی ہے جبکہ یہ اپنے بڑے بھائیوں نذیر ناجی اور علی اکبر عباس کے حوالے سے دل پر چڑھ جانے والی تحریر لکھنے کا شاید خواہش مند ہے یہ کب لکھے گا یہ سوچ کر ڈر لگتا ہے،

علی اصغر عباس پینٹ کوٹ میں ہو تو افسر اعلیٰ لگتا ہے، بڑے برینڈ کی شلوار قمیض کے ساتھ واسکٹ پہنی ہو تو تبلیغی لگتا ہے، نری ٹی شرٹ اور پینٹ میں ہو تو لگتا ہے پلازے کا کرایہ لینے جا رہا ہے یہ جب تک شعر نہ سنائے لوگ اسے شاعر ہی سمجھتے،

بزرگوں کے ساتھ بیٹھا ہو تو یوں لگتا جیسے رقم بڑھانے کا مطالبہ کر رہا ہو،

اپنے ہم عمر لوگوں میں بیٹھا ہو تو ایسی ایسی گالی بکتا ہے کہ سننے والوں کے منہ لال اور کان کالے ہو جاتے ہیں مگر یہ سب کے تاثرات کو نظر انداز کرتے ہوئے یہ اپنے اُسی منہ پر رومال پھیر کر پھر نئی گالی کے لیے تیار ہو جاتا ہے اس کو اس کیفیت سے نکالنے کا بس ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھا جائے اور پیار سے شعر سنانے کی فرمائش کی جائے، اس کے لیے شعر و شاعری سے آگے کچھ نہیں، کہ یہ ادب کی پیاس رکھتا ہے، اگر اس کی شعری پیاس بجھا دی جائے تو پھر یہ علی اصغر ہے، ورنہ مرتا پا عباس تو ہے ہی، سو آپ کی جانب سے ایک بڑے شاعر بڑے انسان اور عزیز دوست کے لیے نعرہ لگاتا ہوں کہ علی اصغر عباس زندہ باد۔ اور محمد جمیل، چلو چھڈ دیار۔

(اکادمی ادبیات کی تقریب میں پڑھا گیا۔)

☆☆☆☆☆

شاعری بھی عجیب گُنجھل ہے

شاعری بھی عجیب گُنجھل ہے
کچھ طلوع و غروب کا اس کے
کوئی قانون ہی نہیں، جس سے
کوئی اک سلسلہ سا بن پائے، اس کی کیمسٹری سمجھنے کا
(خود سے کرنے کا یا اُترنے کا)
کب یہ آئے، کہیں رُکے کب تک اور کس موڑ پر چلی جائے!
اس کی تفہیم ہی نہیں ممکن
ہے زمان و مکاں سے یہ آزاد
اس کے آنے کا اور جانے کا
نہ کوئی وقت ہے نہ رستہ ہے

شاعری بھی عجیب گُنجھل ہے
بعض اوقات تو مہینوں تک دور چلتا ہے خشک سالی کا
ذہن کی بے چراغ گلیوں میں
اس کی آہٹ کی روشنی تو کیا
کوئی سایا نظر نہیں آتا
ایسے لگتا ہے جس طرح ہم سے
اس کی وہ گہری دوستی تو کیا
جان پہچان بھی نہ تھی کوئی
بے یقینی کے اس سمندر میں
ایسی کچھ کشتیاں بھی چلتی ہیں
یہ جو بکھری ہوئی کتابیں ہیں!
یہ جو اشعار کے ہیں دفتر سے!
یہ کسی اور نے لکھے ہوں گے؟

شاعری اک عجیب گُنجھل ہے
یہ کبھی ہلکے بادلوں کی سی
دور سے ہی دکھائی دیتی ہے
اس قدر دور سے کہ چلنے میں
رُخ ہوا کا بدل نہیں پاتا
نہ فضا میں نمی اُترتی ہے
بے پنہ فاصلوں کے جنگل میں
راستہ کاٹتی نہیں لیکن
اتفاقاً کبھی جو مل جائے
یوں گزرتی ہے پاس سے جیسے
اجنبی ، اجنبی سے ملتے ہیں

شاعری اک عجیب گُنجھل ہے
ہاں کبھی اس طرح بھی ہوتا ہے
جانے آتے ہیں کس طرف سے یہ سرتاپا بھیگتے ہوئے بادل
اور اک آنکھ کے جھپکنے میں
گھیر لیتے ہیں سارے منظر کو
ہر طرف، ہر جگہ یہ ہوتی ہے، خوش ادا، خوش نما خیالوں کے

جگمگاتے ہوئے ستاروں کی
دیر تک اور دُور تک بارش
ایک مصرعے سے دوسرا مصرعہ، اس طرح سے نکلتا آتا ہے
جیسے سپنے سے اک نیا سپنا
جیسے طوفاں کی سرپھری لہریں!
ابھی پہلی ٹھہر نہیں پاتی، اُس سے دس درجہ تیز اور منہ زور
دوسری سر پہ چڑھتی آتی ہے
راہ سے راہ اور بات سے بات
خود بخود ہی نکلتی آتی ہے
سب جسے شاعری بتاتے ہیں
ایسے لگتا ہے، واقعی کوئی
ایک دیوی ہے جس کے جادو نے
ایسے شاعر کو باندھ رکھا ہے
اُس کا ''معمول'' ہو کوئی جیسے
جب بھی تخلیق کا کوئی لمحہ پھیلتا جائے اور پھر اک دن
خود بھی دنیا سمان ہو جائے
شاعری یوں کلام کرنے لگے اپنی ہستی کو بھول کر شاعر
ایک کاتب کی شکل میں ڈھل کر
جو سُنے بس وہی لکھے جائے
تو سمجھ لو کہ اُس کی دیوی نے اپنی آنکھوں میں بھر لیا ہے اور
اب وہ اس راستے کا ہر منظر
اک نئے زاویے سے دیکھے گا
یعنی شاعر کی ہے یہی پہچان شاعری جو بھی رنگ دکھلائے
اُس کی تفصیل سے بنا اُلجھے، اُس کو دیکھے، سمیٹتا جائے
اور یہ جان لے کہ اب یہ سب
ان ہی نیرنگیوں کا حصّہ ہے
شاعری بھی، یہ وقت بھی، وہ بھی
ایک ہی سلسلے کی کڑیاں ہیں
زندگی بھی، یہ بخت بھی، وہ بھی
کیا انوکھا سوال ہے یعنی
خود ہی اُلجھن ہے، آپ ہی حل ہے
شاعری بھی عجیب گُتھل ہے

امجد اسلام امجد

رافی

برگ گُل سے بنائی مورت ہو
ہائے تم کتنی خوبصورت ہو

میرے احساس کی تجلی ہو
میرے وجدان کی بشارت ہو

نبضِ ہستی کو جو رواں رکھے
تم مرے خوں میں وہ حرارت ہو

میں جسے آج تک سمجھ نہ سکا
تم محبت کی وہ بجھارت ہو

میرے فکر و خیال کی رفعت
میرے جذبات کی طہارت ہو

شعر و عرفاں کی روشنی ہو تم
کس قدر خوشنما عبارت ہو

دھیان جس کا طواف کرتا ہے
دل کی نگری میں وہ زیارت ہو

دل کو پھر زندہ کر دیا جس نے
اک نئی صبح کی بشارت ہو

مجھ کو لے لیتا ہے جو بانہوں میں
ایک ایسے شجر کی صورت ہو

اس کا ادراک تم کو کیا ہو گا
میرے ادراک کی ضرورت ہو

جس کے معنی کو میں سمجھتا ہوں
حُسنِ اظہار کی وہ صورت ہو

جس کی تشنہ لبی نہیں جاتی
شوقِ دیدار کی وہ حسرت ہو

زندگی کی فریب کاری سے
بچ نکلنے کی ایک صورت ہو

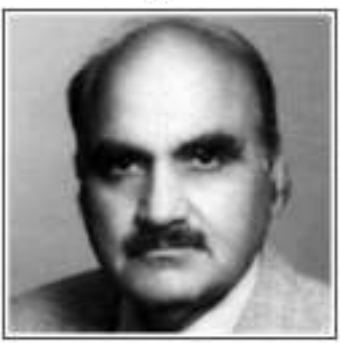

جمیل یوسف

گھاؤ

لیے پھرتا ہوں گھاؤ اپنے سینے میں
بنا مرہم نہ جس کا وقت بھی کوئی
امورِ منصبی نمٹانے کی خاطر
نکلنا پڑتا ہے گھر سے
وگرنہ کون گرم و نرم بستر
چھوڑتا ہے اتنی سردی میں
کوئی دفتر گیا
فارغ ہوا
اور بیٹے سے کہا تم بعد میں
آرام سے بس میں چلے آنا
مجھے تھوڑی سی جلدی ہے
وہ اک ویگن پہ بیٹھا، چوک سے جس کو گزرنا تھا
جہاں پولیس ہوتی ہے
ڈرائیور ممکنہ چالان کے ڈر سے
ہوا تھا بدحواس ایسا
بھگا دی اس نے گاڑی
نہر کے کچے کنارے پر
جہاں پر وہ توازن اپنا کھو بیٹھا
گری بھی وین پانی میں
مسافر ہو گئے غرقاب کوئی بھی نہ بچ پایا
گیا وہ جان سے خود بھی
گنوایا اس نے کتنے قیمتی نایاب ہیروں کو
ترپن سال پہلے کا یہ صدمہ ہے ابھی تازہ
لیے پھرتا ہوں گھاؤ اپنے سینے میں

نظر نہ آنے والے دکھ

چار جانب اٹھی فصیلوں نے
ایک ایسا حصار کھینچا ہے
کیسے تجھ سے ملیں کہ نادیدہ
بندشوں نے مدار کھینچا ہے

غیر مرئی سی ہیں یہ دیواریں
کب نظر کو دکھائی دیتی ہیں
ڈال دیتی ہیں پاؤں میں زنجیر
کم کسی کو رہائی دیتی ہیں

جب کسی کو ہو شوق چلنے کا
روک لیتی ہیں راستہ اکثر
سدِ باب سفر ہے ان کا ہدف
ختم کرتی ہیں سلسلہ اکثر

لیکن اپنا مشاہدہ ہے یہی
حوصلے جاوداں ہی رہتے ہیں
پاؤں رُکتے کبھی نہیں دیکھے
چلنے والے رواں ہی رہتے ہیں

گلزار بخاری

نظم

میں نظم کی انگلی پکڑ کر جب چلا
تو راستے میں
مجھ کو میری کمسنی کے دن
اچانک مل گئے
معصومیت کے رنگ میں لتھڑے ہوئے
مہکے ہوئے
وہ دسترس کو آزماتی تتلیوں کے پیار میں
بہکے ہوئے
پھر نظم کچھ آگے بڑھی
میں بھی ڈرا آگے بڑھا
میری جوانی کے شب و روز آ گئے
سب معصیت کی آگ سے لپٹے ہوئے
بے رہروی کی لو بڑھاتے
گل رخوں کے عشق میں بہکے ہوئے
پھر نظم کے اصرار پر میں رُک گیا
آگے نہ کوئی رنگ تھا
آتش نہ تھی
اک منجمد تاریک شب تھی
اور میں بیتے دنوں کی یاد میں گم
راستے سے لوٹ آیا
یہ مری حدِ ادب تھی

صفدر صدیق رضی

نظم

کبھی تم نے
آغوشِ مادر میں سہمے ہوئے
اس بھکارن کے بچے کے بارے میں
سوچا نہیں
جسکا پہلا قدم
ماں کے پھیلے ہوئے دونوں ہاتھوں کے
زینے پہ ہے
جس کا اگلا قدم
حُرمتِ آدمیت کے سینے پہ ہے

نظم

نظم ایسی خوبرُو دوشیزہ ہے
لفظ و معانی کے جواہر سے لدی
پیہم بنی سنوری
جو حرف و صوت کے روشن دریچے میں کھڑی
یُوں منتظر ہے
کوئی عاشق آئے
اور اسکو اشارے سے بلائے
جس کی باہوں میں وہ باہیں ڈال کر
گھر سے دبے پاؤں نکل جائے

کچھ دیر ٹھہر

زمانے!
گلی میں صدا تُو نے دی ہے
تو بستی میں کہرام سا مچ گیا ہے
شبِ تار میں جگنوؤں کی قطاریں
اندھیرے کی دیوار میں
دَر بنانے کی کوشش میں ہیں
تیرگی منہ چھپاتی ہُوئی پھر رہی ہے
کئی روز سے رات ٹھہری ہُوئی تھی
مگر تُو نے آواز دی
تو یہ منظر بدلنے لگا ہے
مرا قافلہ پھر سے چلنے لگا ہے
مگر
ٹمٹماتے ہُوئے جگنوؤں کی قطاروں سے
سورج اُبھرنے میں کچھ دیر ہے
میری مٹی سنورنے میں کچھ دیر ہے
بیٹھ جا دل گلی میں گھڑی دو گھڑی
باندھ لُوں مَیں جو رختِ سفر پاس ہے
راستے میں کھڑی شام سے مل تو لُوں
مَیں سرِ شاخِ دنیا ابھی کِھل تو لُوں

خاور اعجاز

حمدیہ نظم

نقابِ صبح جب بھی چاک ہوتا ہے
چمکتے سنگریزوں، جھومتے پیڑوں
زمیں کی کوکھ سے پھوٹے ہوئے بیجوں پہ
کوئی حمد لکھتا ہے

کوئی لکھتا ہے
جلوہ گاہِ دنیا میں
کسی اقرار کی ساعت کا جادو ہے
جو طاری ہے
ازل سے تا ابد اک نور جاری ہے

مرے مالک! یہی تو حمد ہے تیری
جو روز و شب کی اس تقسیم پر
اپنی نمو کی اولیں ساعت میں
برگِ گل پہ بکھرے شبنمی قطروں نے
لکھی ہے

یہی ہے تذکرہ تیرا
جسے ہر ڈوبتا سورج
کسی لوحِ اُفق پر آتشیں رنگوں سے
خود تحریر کرتا ہے

یہی تکبیر ہے تیری
جو اِس موجِ نفس کے آنے جانے میں
ترے ہر اسم کی گردان کرتی ہے
کسی ذی روح لمحے سے،
کسی اک دوسرے ذی روح لمحے میں
بہت آہستگی سے منتقل ہو کر
ترا اعلان کرتی ہے

مرے مالک! یہی تسبیح ہے تیری
کہ جو ہر ابتدا و انتہا سے ماورا
گزرے زمانوں
آنے والے سارے لمحوں کے لئے محکم ہے
آب و خاک میں
بہتی ہواؤں، بادلوں میں
اور برستے پانیوں میں
اور تہہِ آبِ رواں

شاہدہ حسن

موجود سانسوں

میں بھی جاری ہے

کہ جب تنہائی کی وحشت سے

دل صحرا نما ہو جائیں

جب تاریکیاں گھیرے ہوں دل کو

اور دل تجھ کو پکارے

چاہے جس پیرایہء حرف و بیاں میں

نام لے تیرا

تری آواز آ جائے

کہ ہاں اے میرے بندے

میں ترے نزدیک ہوں

تیرے بہت نزدیک

___ ان بہتے ہوئے اشکوں سے بالکل متصل

دم توڑتی آہوں

ترے سینے میں گونجے لفظ کے بے حد قریں

دل کو ترے تھامے ہوئے

میں ہوں-------

مسلسل ہوں

میراجی کے نام

میراجی تم میراجی ہو
میراجی ہم جانتے ہیں
تم صرف ثناءاللہ تھے پہلے
آخر اک دن میراسن کے عشق میں میراجی کہلائے
اور جب میراجی کہلائے
تم نے ثناءاللہ کے دل کی دھڑکن کو
اپنے اندر مار دیا

جانتے ہیں ہم
تم اچھی نظمیں لکھتے تھے
منٹو کے افسانوں جیسی
کرشن کے سچے کرداروں میں ڈوبی نظمیں
آدھے دھڑ کے انسانوں پر پوری نظمیں
حیوانوں پر پوری نظمیں
لیکن---سچ ہے
منٹو نے اپنے خاکے میں جتنے رنگ بھرے تھے
اصل میں اُن رنگوں میں تم جتنے عریاں ہو،
منٹو بھی عریاں ہے
لیکن --- یہ بھی سچ ہے
منٹو اپنے افسانوں میں منٹو ہے اور تم اپنی
نظموں میں میراجی ہو

سچ ہے، تم نے
صحراؤں کی خاک نہ چھانی لیکن پورے صحرا تھے تم
قیس کے دشتِ جنوں کی اُڑتی دھول
تمھارے اندر بھی تھی
آنکھوں میں وحشت کا سایہ بھی لرزاں تھا
تم نے بہتے دریاؤں کی سرد روانی بھی دیکھی تھی
میراسن کی گرم جوانی بھی دیکھی تھی
پھر معلوم نہیں کیوں آخر
نگری نگری پھر کر اپنے گھر کا رستہ بھول گئے
نئی کہانی لکھتے لکھتے پچھلا قصہ بھول گئے
دل پر نظمیں کہتے کہتے دل کی دنیا بھول گئے
میراسن تو میراسن تھی، خود کو پورا بھول گئے
اور پھر اک دن
جانے کہاں سے اپنی نظموں میں تم
دُھول اُڑاتے، اَن دیکھے منظر لے آئے
شاید تم نے ثناءاللہ کے دل کی دھڑکن سُن لی تھی
اِس دھڑکن کو سُن کر تم نے میراسن کو
اپنے اندر مار دیا
لیکن---شاید میں نہیں سمجھا،
لیکن---شاید تم نہیں سمجھے
میراجی! تم میراجی تھے
میراجی! تم میراجی ہو---!!
میراجی! ہم میراجی کی نظموں کے شیدائی ہیں
ہمیں ثناءاللہ سے کیا لینا دینا---!!

خالد علیم

قیدی

ہر ایک خواہش ہر ایک کوشش ہر ایک اُلجھن
ہمارے ذہنوں ہمارے جسموں سے پھوٹتی ہے
کوئی بھی مجرم نہیں ہے شاید مگر سبھی جُرم کر رہے ہیں
ہر ایک ذہن اپنی اُلجھنوں کی
ہر ایک جسم اپنی خواہشوں کی
ازل سے تکمیل کر رہا ہے، وہ جی رہا ہے
وہ مر رہا ہے
دیارِ ہستی سے غم گزیدہ گزر رہا ہے

یہ جتنے راہوں کے پیچ و خم ہیں
یہ ظلم و جور و جفا ستم ہیں
تمام ذہنوں کی اور جسموں کی اُلجھنیں ہیں
ہم اپنے ذہنوں کے اور جسموں کے کب
سے قیدی بنے ہوئے ہیں
ہم اپنے صیاد خود بنے ہیں

کرامت بخاری

زمانہ

کوئی سُر ہو یا کوئی ساز
یا ہو سنگیت کا سرگم کوئی
یا محبت کے مراسم کا ہو موسم کوئی
کوئی کھوئی ہوئی صورت، کوئی صورت
کہیں سایہ کوئی
کوئی اپنا یا پرایا کوئی
جب کہیں کچھ بھی نہیں ہے تو مرے چارہ گرو!

زیست کرنے کا کوئی اور بہانہ ڈھونڈو
جس کا اس تلخ حقیقت سے تعلق بھی نہ ہو
کوئی معصوم سا موہوم فسانہ ڈھونڈو
کوئی کھویا ہوا خوشیوں کا خزانہ ڈھونڈو
اپنا زمانہ ڈھونڈو

خود۔ جزیرہ رات کا آخری مشورہ

بس اب بھاگنا بند کرو
کیا رات ہے!
نوکیلے تاروں میں الجھا تاج نما اک
چاند ہے
اور بے رنگ---
کہ پل پل رنگ بدلتا اک ہالہ ہے!
رک جاؤ
اب رک جاؤ
بھاگنے سے کیا فاصلے کم ہو جائیں گے؟
سچ مانو، تم تھک ٹوٹ چکے ہو
بریف کیس کو تھامے ایسے بھاگتے
بھاگتے،
ہانپتے ہانپتے
یہیں، یہیں، بس یہیں رُکو
اس مین ہول کا ڈھکن کھینچو
ہاتھ میں تھامے بریف کیس کو اندر پھینکو
وہ بے رنگ---
کہ پل پل رنگ بدلتا ہالہ نیم غنودہ ہے
مسنون دعا دو ہراؤ
لیکن دھیان رہے---
تیز ہَوا میں--- سانسیں چیخ نہ جائیں
یہ سمٹی سمٹائی زندگی بکھر نہ جائے
ٹائمز اسکوائر
شِلڈر گاسے
ینگ اسٹریٹ
ریگل چوک میں
اس فٹ پاتھ پہ دھرنا مارے
منگتے کے قدموں میں
آئی فون، روابط، چیٹنگ
لین دین کے عددی کھاتے
آدھی پنسل، خالی خولی چیک
ایرو بکس گائیڈ
جان ایف کینیڈی: ایک سوانح
یہ کل کا اخبار، پھٹے تقویمی زائچے
اور وہ--- وہ سب
وہ سب کچھ بھی بکھر نہ جائے
دھیان سے--- دیکھو
کب تک بھاگتے جاؤ گے؟

حامد یزدانی

یوں خود سے --- یا پھر جانے کس سے!
بھاگنے سے کیا فاصلے کم ہو جائیں گے!؟
رُک جاؤ
بریف کیس سے جان چھڑاؤ
وہ بے رنگ کہ پل پل رنگ بدلتا ہالہ اب
بھی نیم غنودہ ہے
مسنون دعا دوہراؤ
جلدی سے تم
مین ہول کا ڈھکن کھینچو
اور بس --- پھر
آسمان کو دیکھو!
دونوں بازوؤں کو --- آزادانہ حرکت دیتے
ہونٹ سکیڑ کے سیٹی بجاتے
مال روڈ کے بیچوں بیچ چلے جاؤ
یوں بھی ٹریفک کم ہے
شہر میں
خوف زیادہ ہے
اتوار ہے --- شاید آج
مگر سوموار بھی ہو تو کیا ہے!
کوئی تمھارا کیا کر لے گا!؟

صحرا شاموں میں اک شام

اُس نے اِک روز یہ پوچھا مجھ سے
بن مرے کیسے گزرتے ہیں شب و روز ترے
کون آتا ہے تری رات کو روشن کرنے
کس کے گیسو یہ ترے شانوں پہ لہراتے ہیں
میں نے اُس شوخ کے ہونٹوں پہ تبسم دیکھا
اور رخساروں کی شادابی و رعنائی بھی
اپنی آنکھوں میں سیہ خون کی پت جھڑ دیکھی
اُس کی آنکھوں میں عجب رنگ کا موسم دیکھا
نارسائی ہی جو دستورِ زمانہ ٹھہری
نارسائی پہ کسی شخص کے ماتم کیسا
(اور ماتم بھی کریں گے تو نہیں کچھ حاصل)
صحنِ گلشن سے گزرتے ہوئے شبنم جیسے
چھوڑ جاتی ہے رگِ گل پہ نشاں بوسوں کے
فطرت صبح میں ہیں گلشن و صحرا یکساں
اور تواتر سے ہیں دونوں رقصاں
آس میں رنگ عجب زندگی بھر جاتی ہے
یاس کے دشت میں بھی زندگی کٹ جاتی ہے
کوئی خوشبو بھی میسر نہیں آتی جو مجھے
میں تری یاد کی خوشبو سے مہک جاتا ہوں
اپنی دہلیز پہ اِک پھول سا رکھ جاتا ہوں

اسلام عظمی

تصادم

ہمیں پتہ ہے یہاں نیک نیتی ہے جرم
یہاں خلوص بھی خالی نہیں ہے خطرے سے
ہیں ایسے عہد میں زندہ جہاں صلاحیت
ہر ایک شخص کے دل میں کھٹکنے لگتی ہے
اگر ہو علم تو جانو زمانہ دشمن ہے
اگر جو ظرف بڑا ہے تو سمجھو مارے گئے
جہاں ذرا سی بھی سچائی زہرِ قاتل ہو
وہاں گزارنا ڈنکے کی چوٹ پر جیون
بہت کٹھن ہی سہی پر ہمیں گزارنا ہے
جو ایک آدھ ہی فرعون ہاتھ آتا ہے
کبھی قلم کبھی نوکِ زباں سے مارنا ہے
ہمارا سچ ہی وہ نیزہ ہے جو ہمیں کسی دن
فشارِ سینۂ ظلمات میں اُتارنا ہے

فرحت عباس شاہ

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ہم تو ٹھہرے دیوانے بستیوں میں ویرانے
اہلِ عقل کیوں خالد پاگلوں کو گھیرے ہیں

ڈاکٹر عبدالقدیر خان

گُل تھے، چمن، بہار تھے عبدالقدیر خان
ایک ایسے تاجدار تھے عبدالقدیر خان

وہ وقت یادگار رہے گا تمام عمر
جس وقت کی پکار تھے عبدالقدیر خان

سب کچھ وطن کے نام پہ قربان کر گئے
اِس درجہ جاں نثار تھے عبدالقدیر خان

ہر شخص اُن کی موت پہ غم سے نڈھال تھا
ہاں ایسے شہریار تھے عبدالقدیر خان

باغِ حیات جس سے مہکتا رہا سدا
خوشبو کا وہ دیار تھے عبدالقدیر خان

غم ناک آنکھ ہوگئی اُن کی جدائی سے
ہر دل کا اعتبار تھے عبدالقدیر خان

چلنے سے جس پہ منزلِ مقصود ملتی تھی
ایک ایسی رہ گزار تھے عبدالقدیر خان

محسن وطن کا اُن کو کہے گا ہر ایک فرد
ہر دل کا ہی قرار تھے عبدالقدیر خان

اُن کے ندیم اور کیا اوصاف میں لکھوں
بس پیار، پیار، پیار تھے عبدالقدیر خان

ریاض ندیم نیازی

دسترس [نثری نظم]

مجھے یقیں ہے
کہ تم
میری دسترس میں نہیں ہو
راستوں کی گرد میں
اَٹی
اَن دیکھی
مسافت کی طرح
اُداسیوں سے کشید کیے
کسی نقشِ ناتمام کی مانند
تم
میری دسترس میں نہیں ہو
اور مجھے گماں ہے
کہ میں خود اپنی بھی
دسترس میں نہیں ہوں

طلعت شبیر

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ربط کس سے تھا کسے، کِس کا شناسا کون تھا
شہر بھر تنہا تھا، لیکن مجھ سا تنہا کون تھا

نظم

ایک اک کر کے اوجھل ہو گئیں آنکھ سے کہاں، کدھر
چڑیاں ___ بدلیاں ___ خوشیاں ___ بیٹیاں

چڑیاں! آ کر بیٹھیں آنگن
دانہ دانہ کھایا
گھنا درخت کا سایہ
اُڑ کر چلی گئیں پھر جانے
کس جانب، کس اور
میں نے چاہا اُن کو جیسے کوئی رنگیں مور
ایک اک کر کے اوجھل ہو گئیں آنکھ سے
کہاں کدھر

بدلیاں!
بدلیاں اُتریں اونچے اونچے پربت
ناپ کے نیچے
بھاگے بچے بھاگے خوابوں کے انبوہ کے پیچھے
صحن میں بکھرے شیشے لاکھوں
ان پر چلے نہ کوئی
بدلی ہوتے تن من اندر باہر جلے نہ کوئی
بکھر گئیں کس جانب جانے مہک مہک، کس اور
من نے چاہا اُن کو جیسے ہاتھ کی پیازی پور
ایک اک کر کے اوجھل ہو گئیں آنکھ سے
کہاں کدھر

خوشیاں ___!
خوشیاں پیٹ کے اندر جنمیں
چہرے اوپر جھلکیں
جیون چادر کھلی تو اُن پر اپنے پیر جمائے
سو سو رنگ دکھائے
خوشیاں حاکم کی باندی تھیں
اُن کا کوئی مقام
لگے نہ اُن سے نام کسی کا کیا سے کیا انمول

خوشیاں ڈھونڈن نکلی دنیا وہ دنیا جو گول
خوشی سے کانٹوں کی جھاڑی کھل کے
ہوئی گلاب
اُس کے بعد عذاب
اُڑ کر چلی گئیں پھر جانے کس جانب کس اور

رخشندہ نوید

چاہوں خوشیاں سونا چاندی چاہے جیسے چور
ایک اک کر کے چلی گئیں سب جانے
کہاں، کدھر

بیٹیاں ___!
بیٹیاں کاپی کتابیں میری
دل کے طاق سجائے
کونے کھدروں سے نرماہٹ چُن چُن
بھرے خزانے
گُل رخ اوپر ہاتھوں سے لکھے تھے کچھ افسانے
اپنے قلم اُدھار
دور تک اُن کے ساتھ چلے کچھ ننگے پیروں والے
اپنے کان کے ڈال دیئے تھے اُن کے کان
میں بالے
ناخن ماس نہ چھوڑے تن کا
مچل مچل گیا تھا دل.....
میں چاہوں وہ چہرے ہر پل
چہرے وہ جھلمل.....
اک اک کر کے ہوگئیں رخصت کس جانب کس اور
آنکھ کھلی تو خالم خالی میرا شہر بھبور!

دھوپ سے دھوپ تک

اُن کا کہنا بجا
حرف وقرطاس کو
قاری اک آدھ بھی اب میسر نہیں
وہ تو کہتے ہیں یوں
کہ جو لفظوں کی دیوار ہے حرف گر
اس میں کچھ جاں نہیں، کچھ بھی امکاں نہیں
سٹال پر سالہا سال تک شعر و آہنگ کو کوئی چھوتا نہیں
اُن چھوئے نقطہ و حرف کے آئینوں میں زمیں
آنکھ کی چاپ سننے کو بے تاب ہے
ان کا کہنا
''مارکیٹوں میں پھر سے Slump آچکا
کہ وہ اگلی کتابوں کے ایڈیشنوں کے عوض
اب کے پھر کچھ نہ دے پائیں گے''
اور ادھر تختۂ جان کو سیاہ کرتے ہوئے
حرف لکھتے ہوئے عمر کم پڑ گئی
آنکھ کی پتلیاں
دھوپ سے دھوپ تک
نیند اور خواب کی اس کمیں گاہ میں
حرف کے شامیانے کی چھاؤں تلے
دن پہ دن رات پر رات کی تہہ لگاتی رہیں
ان کا کہنا بجا
کہ کتابوں کی جھیلوں پہ حرف آشنا پیاس
اپنی بجھانے کو آتے نہیں
حرف آنکھوں کے آگے مسلط اندھیروں کی پتلی
کو اب جھلملاتے نہیں،

حرف گر ___ تو مگر
دھیان کی جھیل میں
دھیرے دھیرے سے پتھر گراتے رہے
چند کاغذ پہ شکلیں اُبھرتی رہیں

ذہن میں کچھ خیالات آتے رہے
ریت اُن مٹھیوں سے بکھرتی رہی
تہمتیں نام سے کچھ کماتے رہے
حرف گر ___ تو کہاں سے کہاں جائے گا
کیا کوئی سچ کبھی تیرے ہاتھوں کی مٹھی
تلک آئے گا
حرف کی گود میں
اپنا سر رکھ کے حرف آشنا
چین کی نیند سونے پلٹ پائے گا ___ ؟
حرف گر ___
کیا بھری بارشوں میں انھیں کاغذوں سے
کوئی ننھا بالک بنائے گا ناؤ!
بہائے گا گلیوں کی ان نالیوں میں!
یا تندروں پہ روٹی ترے کاغذوں پہ دھری جائے گی

رخشندہ نوید

آخری گزارش

مری گفتگو
بھیگے پتوں پہ لکھی وہ تحریر ہے
جو کسی کی سمجھ میں ہی آتی نہیں ہے
مرے خواب
زرتاب کرنوں سے گوندھے ہوئے خواب
تاریکیوں سے بھری کوٹھڑی کی
ٹپکتی ہوئی چھت کے نیچے پڑے ہیں
کہ یہ سکۂ رائج الوقت ہرگز نہیں ہیں
مری سوچیں
مسجد کی الماری میں رکھی پُرنور رحلیں
جو بے کار چیزوں کی صورت ٹرنکوں کے
اندر چھپا دی گئی ہیں
انھیں جھاڑنے، پونچھنے کی کسی کو بھی فرصت نہیں ہے
مری خواہشیں
گوردوارے کے اونچے کلس جیسی تھیں
دھوپ میں جو زیادہ چمکتا تھا
لیکن وہ سب خواہشیں اب
کسی کونے میں بیٹھی بے وقعتی کی سزا کاٹتی ہیں
وہ سارے ارادے
چٹانیں جنھیں دیکھ کر راستا چھوڑ دیتی تھیں
لکڑی کے خم کھائے دروازے ہی بن گئے ہیں
جو بوسیدہ قبضوں سے لٹکے ہوئے
بے یقینی کی آندھی میں بجتے رہے ہوں
فلک سے بھی اونچی نکلتی امیدیں
ہوا، دھوپ، بارش کے رحم و کرم پر
درختوں کی شاخوں میں الجھی پتنگیں ہیں میری امیدیں
رہِ ہستیٔ بے ثمر کے لڑھکتے ہوئے موڑ پر
اب یہ کیسا سے آ گیا ہے
بہاروں سے لب ریز خوش کن زمانے
جنھیں دیکھنے کی تمنا میں سانسوں کی آری
پہ چلتا رہا ہوں
وہ شاید نہیں آ سکیں گے
سنو سا کنانِ مکانِ حوادث
مری چارپائی کو ڈیوڑھی میں لا کے بچھا دو

طالب انصاری

زیست

[نثری نظم]

موسموں کی چالوں نے
اذنِ رفاقت دیا ہے
اک دوجے تک پہنچتے پہنچتے
صدیوں نے کسی اور سیارے پر
اپنی قوتوں کو مجتمع کیا
اک بے خودی نے
حالات کے رُخ پر وار تو کیا مگر
رفاقتوں کے امین
زمین سے پاؤں ہٹانے کو تیار نہیں ہوئے
جنھیں کچھ پالینے کی لگن تھی
وہ رستے ہوئے زخموں سے
روشنی جلاتے رہے
نامعلوم خیال
معلوم کی دنیا میں رقص کرتے
کسی ان سُنی تال پر جھومتے گاتے
دھمال ڈالتے ہیں
میں تو بس
اُس کی سمت چلتی رہی جس نے کہا تھا
جب کبھی مجھ سے ملنے آؤ
موسموں کو مٹھی میں بند کر کے لانا
مجھ سے ملنے آؤ
تو زیست ہمراہ لانا

آسناتھ کنول

آواز کے رنگ (نثری نظم)

یہیں کہیں
خوابوں سے دُور
پھولوں سی شکلیں
گم صم
مجھے دیکھ کر مسکراتی فضا میں
ہوا کے گیت
کائنات کی مٹھی میں بھر کر
دریا کی لہروں میں مقید
برزخ کا ٹوکن لیے ہوئے
محض تصور کے ریشم کے بہکاوے پر
مٹی کی آخری نشانی کا چراغ جلنے تک
حوادث کی تہہ در تہہ ترسیل
درد سے بھیگے ہوئے لوگ
جنھیں ایام گذشتہ کی زبوں حالی کا سوگ
رات کے پچھلے پہر جگاتا ہے
کسی گوشہ عافیت کی سرخوشی میں
اندیشوں کے واہمے
روانی کی بھیک مانگتے ہوئے لرزتے ہیں
اندھیرے کی کان سے
روشنی کے ریزے بھٹکتے..... بھٹکتے
مسافتوں کے نیلے سمندر میں
اپاہج ساعتوں سے فرار کی مسل
محبت کی فرد جرم کا ثبوت مانگ رہے ہیں
یہیں کہیں
لامتناہی اور بے ہنگم شور کی لہروں کے
ملکوتی بہاؤ میں
توازن کی یکتائی گونجتی ہے
میرے کانوں سے مانوس آواز کے رنگ
بکھر جاتے ہیں

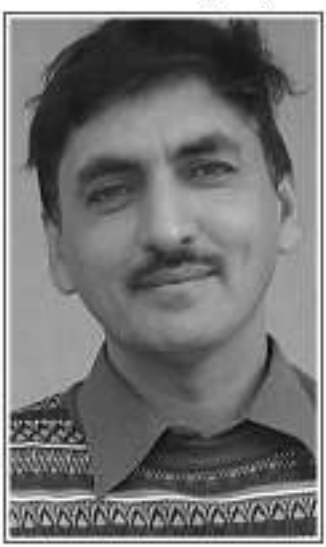

امجد بابر

نظم

وہ پاگل ہوں کہ میری شاعری میں
مرا دیوانہ پن بھی بولتا ہے
میں لفظوں کی ہوں جادوگر کہ میرا
یہ ہر ہر لفظ آنکھیں کھولتا ہے

مرے اندر چھپا طوفاں ہے کوئی
مرا دل اک بھنور میں ڈولتا ہے
مرے کانوں میں یہ چیخیں ہیں کیسی
کہ کوئی میرے اندر بولتا ہے

گرے جو آشیانہ آندھیوں میں
اسے جھونکا ہوا کا رولتا ہے
ستایا موسموں کا ہو، جبھی تو
پرندہ، ہجر کے پر کھولتا ہے

صدا وہ ہی دلوں کے پار اترے
محبت سے جو کوئی بولتا ہے
وہی، دھن میرے دل کو بھی ہے بھائے
جو نغمہ کان میں رس گھولتا ہے

کوکی گل

الجھن

الجھ سی گئی ہوں
نیا سال ہے تو
پرانے کا کیا ہو!!!!
مرے پاس ایسے بہت سال ہیں۔۔۔،
کہاں پر سجاؤں؟

کسی شیلف پر یہ سماتے نہیں۔۔۔،
نہ یہ ٹوٹ جائیں
یہ گٹھڑی میں بھی باندھے جاتے نہیں،
مرتب رہیں۔۔۔
یہ ملبوس ہیں کیا؟ کہ دے دوں کسی کو
جو مجھ پہ ہے گزرا، وہ میرا رہے گا
سمجھ سے ہے باہر
کہاں رکھ کے آؤں؟

جہاں پر گزشتہ کئی سال رکھے
وہ بجھنے لگے ہیں
انھیں سانس لینے کی حاجت نہیں کیا؟
کہ زندہ ہیں گر تو کبھی ملنے آئیں
اگر مر چکے ہیں تو مدفن دکھائیں

مری کچھ دعائیں،
ابھی ان کہی تھیں
ردائیں بھی خواہش کی کھولی نہیں تھیں

جو گزری ہے اس کے کئی پل
تو میں نے چھوئے بھی نہیں تھے

لکیریں مٹیں جو پڑھی بھی نہیں تھیں
بہت دن تھے جن کی تہیں کھولنا تھیں،
لپیٹے گئے وہ!

یہ ظالم سفر ہے
وہ سب کچھ جو ہاتھوں سے کھونا تھا مشکل!
گئے سال کیا کچھ نہیں لے گئے۔۔۔
جہاں پر گئے، سب وہیں لے گئے۔۔۔
اگر ملنا چاہوں تو حد نظر تک دکھائی نہ دیں گے

کبھی چھونا چاہوں
تو بھی خود تلک یہ رسائی نہ دیں گے
تو پھر کیا کروں۔۔۔؟
جو میرے تھے اب وہ بھی میرے نہیں کیوں؟
الجھ سی گئی ہوں!

سعدیہ بشیر

سخن کی بھیک (نعتیہ نظم)

مدینے کے شمال میں
اُحد کی شاہراہ پر کھڑا
یہ سوچتا تھا میں

بہت حسین وقت تھا
بڑا سہانا وقت تھا
کہ جب مرے نبیؐ کے نازنیں قدم
پڑے دیارِ قدس کی زمیں پر
تو خوشبوؤں کے ساتھ ساتھ
اجالے ہر طرف مہک گئے

وہی اجالے آج بھی
مہکتے ہیں گھڑی گھڑی
ہوائیں گیت گاتی ہیں
بنی نجار کی وہ نعت خوان بچیوں کے
زمزمے
فضا میں گونجتے سنائی دیتے ہیں
عقیدتوں محبتوں کی لازوال روشنی
شعورِ عشق و آگہی میں
ڈوبے عطر بیز لمحوں کا دیتی ہے
سراغ آج بھی
جدھر بھی دیکھیے

نظر اٹھا کے شہرِ پاک میں
ہر ایک سمت نور کا ظہور ہے
غبارِ درد جو میں اپنے ساتھ لے کے آیا تھا
وہ مجھ سے کوسوں دور ہے
قدم قدم مرے تلے
علوئے کوہِ طور ہے

میں کتنا خوش نصیب ہوں میں کتنا کامگار ہوں
درِ رسولؐ سے مجھے
سخن کی بھیک مل گئی
سخن کی بھیک مل گئی

مظہر حسین مظہر

تکمیل خواہش (نثری نظم)

نگہت اکرم

ایسے ہی اچانک تم پر نظر پڑی
میں ٹھٹک گئی میں رک گئی
تم آگے بڑھے میں پیچھے ہٹی
تم رک گئے میں چل پڑی
تمھیں دیکھ لیا تمھیں مل نہ سکی
پھر یہ ہوا
میری سوئی خواہش جاگ اُٹھی
دھڑکن دھڑکن تجھے پکارا
پھر یہ ہوا
تم آنکھ کے رستے
دل میں اُترے
تم یاد رہے
تمھیں بھول نہ پائے

انتخاب

- خالد احمد -

نعمان منظور

ظاہر نہ کسی کور نظر پر بھی ہُوا میں
کیا فرق پڑا ، تجھ پہ کُھلا ، یا، نہ کُھلا میں

نثری نظم

سنتے ہیں کہ ورکنگ پلیس پر
کوئی کسی کا دوست نہیں ہوتا
اپنے اپنے مفادات کا لبادہ اوڑھ کر
سب اک دوجے سے ہنس کے بات کرتے ہیں
جتنا مفاد گہرا ہوتا ہے اتنی ہی دوستی"
آگے نکل جانے کی کوشش میں راستہ کاٹنے سے منزل تو نہیں مل پاتی
شخصیت پر گلی قلعی ضرور اتر جاتی ہے
بدرنگ پیتل سے جذبے
فضا میں بدصورتی کا احساس بن کر بکھرنے لگتے ہیں
میری تنہائی مجھے ہمیشہ آباد رکھتی ہے"
منافقت کا خول چڑھائے کھوکھلے چہروں سے
تنہائی کا تریاق ڈھونڈنے سے کہیں بہتر ہے
سورج کے ساتھ دن کو بیدار کرنا
اور چاند کے ہمراہ ستاروں کی انگلی تھامے شب بسری کا سامان ڈھونڈنا
کافی کے مگ میں بچے آخری گھونٹ کے تلخ ذائقے کو من میں اتارتے ہوئے
ہر شب کی طرح" گلزار یا سلیم کوثر" کی کتاب تھامے
تنہائی کے تکیے پر سر رکھ کر خوابوں میں کھو جانا

نائیلہ راٹھور

اے دل!

نظر نظر سے ملا عشق میں فنا ہو جا
مسافرانِ محبت کا رہنما ہو جا

سکوتِ شام و سحر سے کلام کرتے ہوئے
ندائے کن کی حقیقت سے آشنا ہو جا

متاعِ صبر سے دل میں وہ درد پیدا کر
گلوں کا حسن چمن کے لیے صبا ہو جا

نظامِ جبر کے آگے جھکا نہ سر اپنا
صدائے حق و صداقت کا ہمنوا ہو جا

نکل جہاں کے اندھیرے سے روشنی میں آ
کسی نحیف سے دل کی کوئی دعا ہو جا

ترا غرور نہ کر دے کہیں تجھے رسوا
تو بارگاہِ عبادت میں باوفا ہو جا

یہ خواہشات کی دنیا ہے چار دن، اے دل!
بُھلا دے طرزِ کہن اور پارسا ہو جا

حکیم خان حکیم

جنم دن

سدا زندگی میں خوشی کا سماں ہو
نہ فکرِ جہاں ہو نہ غم کا نشاں ہو

تمھارے قدم چومتی کہکشاں ہو
زمیں بھی تمھارے لیے آسماں ہو

تمھی میرے دل بر، تمھی میری جاں ہو
تمھی راز میرا ، تمھی رازداں ہو

مرے پاس یا دور ، چاہے جہاں ہو
دعا ہے کہ تم پر خدا مہرباں ہو

ہمیشہ سلامت رہے پیار تیرا
کبھی راز تیرا نہ ہرگز عیاں ہو

ترا حسن دراصل سیرت ہے تیری
کسی کم نظر سے یہ کیسے بیاں ہو

مری یہ دعا ہے کہ تقدیر تیری
تری خواہشوں کی سدا ہم زباں ہو

ہزاروں برس لوٹ کر یہ دن آئے
ہزاروں برس بعد بھی تُو جواں ہو

محمد آفتاب تابش

اعتراف

کیا تمہیں بھی یاد ہے
ہم نے بھی تو پکڑی تھیں
رنگ رنگ تتلیاں
چند لمحوں کے لیے
ہاتھ میں جو رہتی تھیں
ہم یہی سمجھتے تھے
مل گئی ہو جس طرح
ہم کو ساری کائنات
میری مٹھی میں دبا
تھا تمہارا پیار بھی
پر نجانے کس طرح
تتلیوں سا پیار وہ
قید رکھنے کے لیے
بند تھی جو آج تک
میری مٹھی کھل گئی

وسیم جبران

خطوط

آصف ثاقب

بیاض کے راج دلارے عمران منظور صاحب
السلام علیکم!
مبارک قدم 'بیاض' باعث صد مسرت ہوا۔ ادھر مہینہ چڑھتا ہے ادھر بیاض کا انتظار درد بن کر دل میں اُترنے لگتا ہے۔ 'بیاض' کچھ چیز ہی ایسی ہے کہ ہر شاعر، ادیب کو ایک چیز بنا کر پیش کرتا ہے۔ خالد احمد کی شاعری کے اسباب جمع ہوں تو خاطر جمعی کے اسباب پیدا ہوتے ہیں۔ کلام 'آنسو' آنسو آنسو ہو کے پڑھا۔ عزیز نعمان منظور خالد احمد کے اشعار کے انتخاب میں محبت اور مروت کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان کو خالد احمد سے جو قلبی نسبت ہے وہ آنسو بھری ہے۔ وہ اس باب میں بہت سی تحریریں سامنے لا چکے ہیں۔ جناب محمد ارشاد کے خط سے دورس وتدریس کے روح پرور (ذہن افزا) دریچے کھلے وہ مانیں نہ مانیں 'فنون' کے اعتبار سے ان کے دلدار گان کی کمی نہیں۔ انھوں نے فلسفہ بے شک پڑھا اور پڑھایا مگر ان کی رسائی سائنس کے مظاہر اور شعر وادب کے جواہر تک شروع دن سے رہی۔ انھوں نے متعلم کے طور پر بھی نوع بہ نوع مطالعے نظر میں رکھے اور معلم کی حیثیت سے بھی علمی مشاغل کو رواج دیا۔ کسر نفسی ایک الگ ''چیز'' ہے مگر تحریر، گفتگو اور مباحث سے جملہ ''پابندگی'' کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ محمد ارشاد صاحب کے کسی مضمون پر رائے تو دی جاسکتی ہے اختلاف ممکن نہیں ہو سکتا میں نے ان کے غالب سے متعلق کسی محاکے پر بات کی ہو، بات پھر بات ہے اس سے زیادہ کچھ نہیں۔ محمد ارشاد صاحب علمی امکانات کو پیش نگاہ رکھ کے کچھ لکھتے ہیں کچھ کہتے ہیں۔ ان کے 'بیاض' کے خط میں علمی معلومات کا خزانہ بھرا ہے۔ پھر پڑھنے والا چاہے وہ ادیب (شاعر) ہو یا عام قاری ان کی عزت کرتا ہے۔ ان کی تحریریں دیکھنے کا خواہش مند رہتا ہے۔ Sensation اور Stimulus (مہمیز) ایک جداخانہ انعقاد ہے۔
احمد حسین مجاہد صاحب شریک محفل غزل ہیں۔ ان کے آنے سے محفل میں ہلچل سی ہے۔ آپ جانیں مجاہد نہ صرف ہزارے کی بل کہ پاکستان کی جانی پہچانی ادبی شخصیت ہیں۔ انھوں نے اردو، ہندکو شاعری میں اختصاص کا ڈول ڈال رکھا ہے۔ عروض کے موضوع پر ان کی ایک کتاب اکادمی ادبیات پاکستان کے سائے نکلی ہے جسے مبتدی بھی استحسان نظر سے دیکھتے ہیں اور اہل فن بھی۔ ہزارے میں شعر وادب کے گل وگلزار بہار دکھا رہے ہیں۔ یہاں کے شاعر تغزل آشنا بھی ہے اور 'نظم رسید' بھی۔ افسانہ مزاح اور تنقید کے دست وقلم بھی خوب ہیں۔ فلسفیانہ افتاد کی ہمہ گیری کے کیا کہنے۔ شاہ داستانی شوکت علی شاہ صاحب سیاسی اور انتظامی 'ذاتی' اقدامات کو بڑے دلچسپ اور عبرت انگیز پیرائے سے 'توضیح بیاں' کرتے ہیں۔ حیرت ہے کہ ہماری سیاست اور قیادتمیں کیسے کیسے 'ذہن' کارفرما ہوتے ہیں۔ شاہ صاحب کے کالم بھی 'حرف گیری' میں اپنا ثانی نہیں رکھتے۔ نسیم سحر صاحب نے پھر 'نگاہ' ڈالی۔ میں ان کی کتابیں پڑھتا رہتا ہوں ان کے فن کا قائل ہوں۔
اب کے پھر آفتاب احمد ملک کی 'توجہ بھری' تحریر کو چار چاند لگے ہوئے ہیں انھوں نے مجھے بڑے خلوص سے مذکور کیا ہے۔ اشرف کمال صاحب ایک جملہ سہی لیکن وہ میرے لیے مشرف کمال سے کم نہیں۔ خدا بیاض کو سلامت رکھے۔ خیر اندیش

نسیم سحر

جناب عمران منظور صاحب،
سلام مسنون
بیاض کا شمارۂ دسمبر ۲۰۲۱ء موصول ہوا بہت سی عمدہ (اور کچھ نسبتاً 'کم عمدہ'!) تحریروں سمیت۔ خیر، مطالعہ تو سبھی کا کیا ہے، کہ ادھورے مطالعے پر مَیں یقین نہیں رکھتا۔
سب سے پہلے حمد و نعت، عقیدت، رباعیات، ہائیکو، غزلوں اور نظموں کا علیٰ الترتیب انتخاب:

حمد

حضرت انسان کو تو نے عطا کیں قدرتیں
اپنے اپنے دائرے میں ہر کوئی عبدالقدیر
(سید ریاض حسین زیدی)

ناخدا خود کو سمجھتا ہے خدا
اُٹھ کے کہتے ہیں بھنور اِلّا اللہ
(شہاب صفدر)

گفتگو سے مہک نہ کیوں آئے
ذکر بین السطور تیرا ہے
(سرور حسین نقشبندی)

نعت

تحفۂ نعت جو محفل میں سخنور لائے
آپ کے ہاتھوں ملے گی ایک دن صورت مجھے
اس لیے میں آج تک اترا نہیں ہوں چاک سے
(غلام حسین ساجد)

کوزۂ حرف میں خوشبو کا سمندر لائے
(حسن عسکری کاظمی)

خواب میں حضرت نائب جو ملیں تو پوچھیں
کس طرح شستہ رواں نعت لکھی جاتی ہے
(سرور حسین نقشبندی)

سخنورو، مرے آقا کے در کے ہو جاؤ
بشر کو شر سے نکالا حضور نے آ کر
خرد کو ملتی ہیں دانائیاں مدینے میں
کیا ہے پست کو بالا حضور نے آ کر
(محسن اسرار)
(محمود کیفی)

عقیدت

امن و تہذیب کی اولیں درس گاہ
تھے معلم جہاں کے شہ انبیا
ہم شہ انبیا کی کریں کیا ثنا؟
اُن کے قدموں کی ہیں دھول ارض و سما
(راجا عبدالقیوم)

خالد علیم کی ایک عمدہ رباعی

سورج ہے عجیب ، کچھ اجالا کر کے
اک اگلی صبح کا تقاضا کر کے
ہر رات ستاروں کو بجھا دیتا ہے
ہر روز نکلتا ہے تماشا کر کے

ہائیکو

خاور اعجاز جاپانی ہائیکوز کا اردو ترجمہ براستہ انگریزی سے خوب کر رہے ہیں۔

The May rains; /Even a nameless stream /Is a thing of dread.

اس میں انہوں نے Nameless Stream کا ترجمہ "لہریں لیتی ندی" کر کے پنڈی کے نالہ لئی کو بھی ادبی تاریخ کا حصہ بنا دیا ہے۔

غزلیں:

اظہار پا کے بھی وہ کب اظہار پا سکا
مری چشم شوق کے آئینے میں جو حرف تھا
بے ربط لفظ ، درد کی پوشاک ہو گئے
مری زندگی کا سوال تھا، وہ کمال تھا
خالد احمد

اک غلغلِ سخن تھی سو برپا تھی، ہم بھی تھے
جو تمہارے رخ پہ کرن کی طرح بکھر گیا
لیکن کوئی شکیب نہ تھا، جعفری نہ تھا
وہ جو میرا حسن خیال تھا وہ کمال تھا
خالد احمد
جمیل یوسف

دکھا جاتا ہے خود حرف صداقت اپنی طاقت
فہم سے بھاپ بن رہا ہے وجود
دائل ہوں تو پھر لہجہ نہیں تلوار کرتے
بے شماری سی ہے شمار میں گم
جلیل عالی
محسن اسرار

حسن میں وہ آتش تھی، حسن تھا وہ آتش میں
بے ارادہ ہم نے بھی انگلیاں جلا ڈالیں

صفدر صدیق رضی

جان دے دیتا ہے مالک کے لیے کیوں کتا
کر نہیں سکتے وضاحت کبھی بچھو اس کی

راحت سرحدی

یہ کیوں کہیں کہ ملے ہی نہیں ہیں اچھے لوگ
ملے ضرور، ملے خال خال البتہ

سید ضیاالدین نعیم

ٹیک جائیں گے اسے دن کے اجالے میں کبھی
بزمِ مستاں میں پڑا ہے جو ابھی، آخرِ شب

شوکت محمود شوکت

موت صحرا میں چمکتے پانیوں کا سلسلہ
زندگی برسات میں کچے مکانوں کی طرح

یونس خیال

کس حال میں ہے ظلِ الٰہی کی رعایا
بازار میں آ، دیکھ کبھی گھر سے نکل کر

اکرم ناصر

محبتوں میں مجھے حکومت نہیں ملی ہے
میں صاحبِ اقتدار ہونے سے رہ گیا ہوں

اقبال سروبہ

فقیرِ راہ دعاؤں کی شکل میں اب بھی
طرح طرح کی دوائیں اٹھائے پھرتا ہے

ڈاکٹر فرحت عباس

اُدھر صحرا میں خشکی بڑھ گئی تھی
سمندر کو سکڑنا پڑ گیا تھا

تصور اقبال

ان کے بدن پہ کون سی مٹی کے رنگ تھے
مرنے سے جن کے عارض و لب خاک ہو گئے

افضل گوہر

جی اٹھ آتا ہے بیٹھے بیٹھے
گرچہ پہلے سا وہ چھلاوا نہیں

طارق بٹ

وہ لب دکھا رہے تھے کسی خواب کی بہار
وہ آنکھ کر رہی تھی اشارے میں گفتگو

شہاب صفدر

برف پگھلے تو اس کی نسبت سے
ایک ندی نئی نکلتی ہے

کرامت بخاری

ایک دن پھر قحط پیدا ہو گیا
میرے گھر میں رزق کی بہتات سے

سحرتاب رومانی

میں کیا کروں کہ پھر بھی سفر ہو نہیں رہا
رستے سے کائنات خدا نے ہٹا بھی دی

قمر رضا شہزاد

کیا ہے پوشیدہ مرے ذہن میں کب جانتا ہے
میرے رخسار سے بالوں سے سمجھتا ہے مجھے

سلمانا ہید درانی

رحم کل مجھ پہ عیاں کی ایک بزنس مین نے
کاروبار اپنی جگہ، حبِ وطن اپنی جگہ

بدر منیر

جیرے کشکول میں بھر دیتا میں سانسیں اپنی
زندگی مجھ کو اگر حسبِ ضرورت ملتی

اشرف کمال

میں نیا شہر میں آیا ہوں، مجھے علم نہیں
راستہ پوچھنے والا یہ کہاں جاتا ہے

شاہد اشرف

وہاں اس نے جا کر نہیں کچھ بتایا
جو خلقت ہوئی ہے کہیں آسماں کی

آفتاب خان

بات کرتی ہیں درختوں سے نئے لہجے میں
شور چڑیوں کو مچانے کا ہنر آتا ہے

محمد نوید مرزا

خدا نے سوچ رکھی ہے مری سوچوں کی حد بندی
اسے بس دیکھنا ہے یہ میں کتنا سوچ سکتا ہوں

دانش عزیز

ایک نقطے پہ مل گئے دونوں
ہجر کا دائرہ بناتے ہوئے
عاصم اعجاز

اس نے کہا کہ تم سے محبت ہے آج بھی
اور اس کے بعد فون کا نمبر بدل دیا
عدنان خالد

کتنی مشکل سے اپنے خوابوں میں
میں نے اپنی جگہ بنائی ہے
احمد حسین مجاہد

یہ لوگ زومبی فلم کے کردار ہی نہ ہوں
ہر شخص چلتی پھرتی ہوئی زندہ لاش ہے
شاہد ماکلی

میں نے کل خواب میں دیکھا تھا اسے آتے ہوئے
یہی تعبیر ہے کیا ، آج ہوا آئی نہیں
کاشف حسین غائر

سمجھ سکا ہے اگر کوئی تو بتائے مجھے
صغیر ہونا نہ ہونا سمجھ نہیں آیا
صغیر احمد صغیر

سازشیں ہونے لگی ہیں تیز تر
ساعتِ گلزی تشنگی آ گئی
شہزاد احمد شیخ

یہ شہرِ دشت کے نقشے پہ ہے اُسارا گیا
یہاں پہ میرا کئی دن قیام بنتا ہے
عزیز فیصل

شہر کا شہر بھٹکتا ہوا جاتا ہے کہاں؟
دھیان ہے اُور طرف ، اور قدم اُور طرف
اسحاق وردگ

اسی کے ہاتھ میں ہیں ڈوریاں سب کی
کہانی کار سے پوچھو کہانی کا
علی ذیشان جعفری

تا کہ تیری سمجھ میں آ جاؤں
مجھ کو پورا سمجھ ، دماغ لگا
ساجد رضا خان

کوئی آنکھیں غزل سرا جب ہوں
سارے نغمے فضول ہوتے ہیں
صائمہ آفتاب

ہم قلندر مزاج لوگوں کو
راس آتی نہیں ہے سرداری
ارسلان ساحل

آسمانوں کے اُس طرف کیا ہے
تُو فسانے سنانے والا کون؟
نوید صادق

یوں بھی اِک دن تو مر ہی جانا ہے
آؤ اک دوسرے پہ مر جائیں
جواد جاذل

آخری عمر میں جاتے ہیں مدینے ہم لوگ
مرنے لگتے ہیں تو جینے کا خیال آتا ہے
نادر عریض

امجد اسلام امجد کی واقعۂ کربلا کے حوالے سے نظم "سلام مرا" میں کربلا کا سارا منظر آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ ایک بند:

پھر اُسی شام کے تسلسل میں
شام والوں نے ، اہلِ کوفہ نے

جلتے خیموں سے دربدر ہوتی
روشنی کا جلوس بھی دیکھا

جناب ڈاکٹر خورشید رضوی کی نظم "زمانے سے باہر" کی یہ لائنیں کمال کی ہیں:

زمانے سے باہر کی رو چاہیے میرے دل کو / زمانہ تو اک جزر ہے / مد تو باہر / کسی لازماں، لامکاں سے اُمڈتا ہے۔

رخشندہ نوید کی خوبصورت نظم "رات کی رات" نے پروین شاکر کی یاد تازہ کردی کہ اس نے بھی اس موضوع پر نظمیں کہی تھیں۔ عمدہ الفاظ کے چناؤ کے ساتھ رخشندہ نوید نے کیا کمال کی منظرکشی کی ہے:

رات جینے لگی / گرم پانی کے ٹب میں / محبت کی ادرک بہائی گئی / "آملیٹ اور بریڈ /
چائے دانی میں پانی ابلنے لگا" / "میری ٹائی کہاں ہے" / "اٹھاؤ یہ جوتے انھیں کرکے پالش مرے پاس لاؤ" /

''یہ صورت مرے سامنے سے ہٹاؤ'' / اور چاہت بھری نرم ٹھنڈی ہوا دل کی دہلیز پر /
سرجھکائے کھڑی رسوچتی رہ گئی / ''پیار کی کس قدر مختصر بات تھی / یہ پسندیدگی رات کی رات تھی''
سلیمان عبداللہ ڈار کی ''کاٹھ کباڑ'' کے عنوان سے فکر انگیز باتیں ہیروں اور موتیوں میں تولنے کے قابل ہیں۔ ایک یہی جملہ اگر سمجھ لیا جائے تو ملک کی اور ہم سب کی زندگی سنور جائے کہ: ''سب سے پہلے تو ہمیں ۹۹ کے چکر سے نکلنا ہوگا۔ رزق تو بہ قدرِ مقدر ملے گا ہی، گن گن کر مال جمع کرنے سے اس کی محبت دل میں در آتی ہے، پھر ایسے دل سے محبت منعکس نہیں ہو سکتی''۔
معروف افسانہ نگار اور مترجم جناب حنیف باوا کا مترجمہ افسانہ 'ماں اور بیٹا' کاپی پیسٹنگ میں گڑبڑ کا شکار ہو گیا ہے چنانچہ اس دلچسپ افسانے کو پڑھتے ہوئے بار بار جھٹکے لگتے رہے اور ربط ٹوٹتا رہا۔ افشاں سجاد کا افسانہ 'وہ نمکسار میری' دلچسپ اور اُداس کر دینے والا تھا۔ نشی کی زندگی سے بھرپور شخصیت کا لمحہ لمحہ موت کی جانب سفر قاری کو بھی موت کی تلخ حقیقت کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ یہی موت کی تلخی جناب وقار احمد ملک کے افسانے 'سوجی والے بسکٹ' میں بھی موجود ہے جس میں پروفیسر صاحب کی افسوسناک موت کا ذکر ہے۔ نور کمال شاہ کا افسانہ 'بے چاری' بھی ایک لکھاری خاتون کی موت پر منتج ہوتا ہے۔ شاید اِسے اتفاق ہی کہہ لیں کہ اِن دنوں موت کی تیز رفتاری کے منظر نامے میں یہ تینوں افسانے ایک ہی موضوع پر ہیں۔
میرا خط کچھ طویل ہو گیا ہے لیکن اُمید ہے کہ اختصار کا ادارتی حق استعمال کیے بغیر اسے مکمل شائع کیا جائے گا۔ اللہ حافظ۔
خیر اندیش

کرامت بخاری

جناب عمران منظور و نعمان منظور مدیران بیاض
و برادر اعجاز رضوی
برادرِ گرامی قدر! ___ آپ کا 'بیاض' حسب روایت انتہائی موثر، جامع اور وقیع نظر آیا۔ اشاریہ ہی اتنا مربوط اور بڑے ناموں سے سجا ہوا ہے کہ پرچے کے تمام مندرجات کی اہمیت اُجاگر ہو جاتی ہے۔ آپ نے تقریباً تمام اصناف سخن سوائے قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے سب کو جگہ دی ہے۔ اور 241 صفحات میں اتنا مواد سمو دیا ہے کہ یہ پرچہ ایک مرقع اردو بن گیا ہے۔ آپ نے مکتوبات کو شامل کر کے اسے ایک مکمل جریدہ ادب بنا دیا ہے۔ خطوط دراصل Feed back ہوتا ہے اور بہت اہم ادبی و ثقافتی موضوعات پر سوال اُٹھائے جاتے ہیں۔
دیکھتے ہی دیکھتے 'بیاض' 29 سال کا ہو گیا ہمیں یہ کل کی بات لگتی ہے، مجھے فخر ہے کہ پہلے پرچے سے آج تک شاید ہی کوئی پرچہ ایسا ہو جس میں میں نے حاضری نہ لگوائی ہو۔
'بیاض' اب ایک تحریک بن چکا ہے اور یہ آپ کی محنت اور خلوص کا ثمر ہے۔ محترم خالد احمد کا لگایا ہوا پودا آج تناور درخت بن چکا ہے، گھنا چھتنار درخت جس کے سائے میں تمام لکھنے والے آسودگی اور طمانیت سے سفر جاری رکھے ہوئے ہیں۔ مخلص

ممتاز راشد لاہوری

محترم عمران منظور (مدیر بیاض، لاہور)
سلام و آداب!
'بیاض' (دسمبر 2021) ہمدست و نظر نواز ہوا۔ خالد احمد کی مختصر بحر کی نظم 'آنسو دل کو چھوتی ہوئی گزری۔ شوکت علی شاہ کی آپ بیتی کی حالیہ قسط اُن کے رحیم یار خان میں بطور ڈی سی اپنا زمانہ گزارنے کے حوالے سے تھی۔ بہت خوب رہی اور اس شہر کی مذہبی و سیاسی فضا کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئی۔ افسانوں میں وقار احمد ملک کا ''سوجی والے بسکٹ'' تو گویا کالے کلوٹے پروفیسر حبیب الدین کا خاکہ ہی تھا۔ بہت پُر تاثیر تحریر تھی۔ نور کمال شاہ کے افسانے

”بے چاری“ اور ثمینہ سید کے افسانے ”پارسائی“ نے خوب لطف دیا۔
حمد و نعت کی شاعری میں حسن عسکری کاظمی، سرور حسین نقشبندی، غلام حسین ساجد اور سید ریاض حسین زیدی کا کلام لطف دے گیا۔ خالد علیم کی رباعیات، خاور اعجاز کے ہائیکوز اور گلزار بخاری کے گیت نے بھی کافی محظوظ کیا۔
غزلوں کے حصے میں تو اچھی غزلوں والے اتنے نام ہیں کہ لکھوں تو خط طویل ہو جائے گا۔ بہر حال خوب لطف آیا۔

خیر اندیش

آفتاب احمد ملک

برادر مکرم و معظم عمران منظور جی!

آداب!!

امید ہے آپ بمع سٹاف بخیریت ہوں گے۔ سخن ورانِ ادب کا معتبر جریدہ 'بیاض' بروقت موصول ہوا۔ یاد آوری و آفتاب نوازی کے لیے بصمیم قلب ممنون ہوں۔

241 صفحات پر مشتمل رنگ برنگی ادبی اصناف کا مجموعہ پڑھ کر آپ کے حسنِ انتخاب کی داد دی جاتی ہے حرفاً حرفاً پڑھا۔

حمد و نعت کے بعد 'شاہ داستان' پڑھی۔ شاہ جی نے رحیم یار خان کی تاریخ و جغرافیہ بتایا۔ بہاولپور کی جھلکیاں دکھائی ہیں نیز سرکاری افسران کی نفسیات و مفادات کی تفصیلات گوش گزار کی ہیں۔ نثر و نظم کے خوبصورت الفاظ دلچسپی کے باعث ہیں۔ غزلیات کے صفحات پر درج ذیل قد آور شعرا کا کلام پسندیدہ رہا ہے چند اشعار قدر کرنذر قارئین ہیں:

اظہار پا کے بھی وہ کب اظہار پا سکا
بے ربط لفظ ، درد کی پوشاک ہو گئے

خالد احمد

پھول ڈرتے ہیں زرد موسم سے
سب کی اڑتی ہوئی سی رنگت ہے
عاجزی کا وقار کیا کہنا
خاکساری میں میری عزت ہے

آصف ثاقب

سینئر شاعر و درجن بھر کتب کے مصنف، مورخ اور شاعر غزل جمیل یوسف صاحب کے ایک مجموعہ کا نام غزل بھی ہے (سن اشاعت 2001) غزل کے اشعار معنی خیز و دنا سے پسند ہیں:

جو میری غزل میں غزاں تھا ، وہ کمال تھا
وہ جو تیرا عکس جمال تھا ، وہ کمال تھا
مری زندگی جو گزر گئی تری دید میں
نہ وہ ماہ تھا ، وہ نہ سال تھا ، وہ کمال تھا

جمیل یوسف

حسن اور عشق کی کہانی میں
اک گھڑا ، اور چناب رکھ دیا

عقیل رحمانی

کل تک میں دیکھتا تھا یہاں کیسے کیسے لوگ
اک ایک کرکے آخرش سب خاک ہو گئے

افضل گوہر

اب اور مجھ سے چاہیے کیا اے مرے عزیز!
سر پہ بھی ہاتھ رکھ دیا ، دل سے دعا بھی دی

قمر رضا شہزاد

میری مجبوری ہے کیا کتنے مسائل ہیں مرے
کچھ نہیں جانتا غزلوں سے سمجھتا ہے مجھے

نیلما ناہید درانی

صرف تھوڑا سا انھیں غصہ دلا دیتا ہوں میں
خود بنا لیتی ہے ماتھے پہ شکن اپنی جگہ
داد دے سکتا ہوں پر بے وزن کہہ سکتا نہیں
حسن زن اپنی جگہ حسنِ سخن اپنی جگہ

بدر منیر

ہر طرف زاویے رنگوں کے بکھر جاتے تھے
آئنے کو ترے چہرے کی بشارت ملتی
اشرف کمال

میں بھی وہی لفظوں کی بساط بچھا دیتی ہوں
وہ بھی کوئی چال پرانی چل دیتا ہے
رخشندہ نوید

بولنے کے لیے الفاظ ضروری نہیں ہیں
عام سا شخص بھی جذبوں کی زباں جانتا ہے
شاہد اشرف

زمیں تو مری انگلیوں پہ کھڑی ہے
میں حد دیکھ پایا نہیں آسماں کی
آفتاب خان

جس کی یادوں کی مہک ہے آس پاس
شعر کہتا ہوں اسی کے ہجر میں
محمد نوید مرزا

زمانے والے جو الفاظ ترک کرتے ہیں
میں اُن سے شعر کی لذت کشید کرتا ہوں
ہمایوں پرویز شاہد

دنیا کے مندر میں پوجنا مجھ کو
بُت بناؤ تراش کر مجھ کو
روبانہ رومی

دل چاہتا ہے پھر سے کوئی بزم سخن ہو
پھر اس کو سنانے کوئی ہم تازہ غزل جائیں
ریاض ندیم نیازی

وہ ہجرت تھی یا بے دلی عبث ہے سوچنا ایسا
مگر اس شہر گل کا میں نقشہ سوچ سکتا ہوں
دانش عزیز

مری بھی خواہش تھی میں بھی بحر عظیم ہوتا
نہ جانے کیوں بے کنار ہونے سے رہ گیا ہوں
اقبال سروبہ

پڑھتا ہوں جن سے مائد نگار غزل کا حسن
ایسی روایتوں کو رد کر رہے ہو کیوں
عدنان خالد

ہر گھڑی ورد ہو دعائے قنوت
زندگی شام کا سپارہ ہے
عزیز عادل

انسان ہی تو سب سے بڑا ہے خدا پرست
انسان ہی تو سب سے بڑا بُت تراش ہے
شاہد ماکلی

دیکھ کر مزدور بچہ
زندگی سے میں ڈرا ہوں
عائشہ محسن

ہمیں نہ اپنی محبت میں کوئی قید کرلے
ہمارے پاس قبیلے کی پاسبانی ہے
فخر عباس

احساس، بندگی کا اُسے دیر سے ہوا
غافل، مکوں چھوڑ یہاں ڈھونڈتا رہا
حمید حیدر اعوان

دیکھتے ہو کس لیے زیر و زبر
کیا تمھیں بھی کوئی نکتہ آ گئی
شہزاد احمد شیخ

رات گہری ہے یہاں تو بھی ہے، سنتا بھی
ہم چراغوں کو اندھیروں میں اتر جانے دو
عمران اعوان

مر گئی شہر میں رانجھے کو صدائیں دیتی
شہر میں کوئی سمجھ پایا نہیں ہیر کا دکھ
تاثیر جعفری

لفظ معنی کے طلسمات سے خالی نکلے
جب زمانے نے بڑھایا ہے قلم اور طرف
اسحاق وردگ

امیر شہر کی عیاریاں اُف
چھپا کر شہر دریا بیچتا ہے
عزم الحسنین عزمی

تیری آنکھوں میں جو چمکی ہے دل کو
غزل وہ رات کو میں لے گئی، ہے
شہاب اللہ شہاب

کسی فقیر نے اک جھونپڑی بنائی ہے
اسی جگہ پہ جہاں ہم ملے زمانے تک
عمر قیاز قائل

تتلیوں سی ہوں جھلملیں میری
اس قدر سوچ محفلیں میری
نازیہ رحمان

نظم کو شعرا نے خوبصورت عنوانات سے تخلیقی توانائیوں کا اظہار کیا ہے۔ دونوں نوآموز شعرا کا معیار کلام نظر نواز ہوا (جواد جاذل + نادر عریض) شاعر امروز (صفحہ نمبر 192 تا 197) 8 نئی کتب کے تناظر دیکھ کر اندازہ ہوا کہ معلوماتی، دلچسپ اور تحقیقی تحریروں کے انمول تجزیے ہیں۔ 11 خطوط حقیقتاً تجزیاتی سطور ہیں۔ اصلاحی نقطہ نظر اور خیر وعافیت سے اہمیت کے حامل ہیں۔ فون پر طویل گفتگو کے بجائے خطوط ہی مضمون نگار + قارئین کے رابطے کا ذریعہ ہیں۔ افسانہ نگار دوستوں نے اپنے اپنے زاویوں سے معاشرتی زندگی کے مختلف گوشوں پر قلم آرائی کی۔ روحانی کالم بعنوان 'کاٹھ کباڑ' اصلاحی موضوع ہے۔ "تکبر تو خود بخود دل میں در آتا ہے یہی تو کاٹھ کباڑ ہے یہ دل سے نکل گیا تو محبت خود بخود اپنا آپ منوا لے گی۔" (صفحہ نمبر 28)

گلدستہ شعر وادب، تنقید و تحقیق اور روحانیت سے بھرپور ماہنامہ بیاض خالص ادب کی آبیاری میں اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ بقول خالد احمد کہ:

کچھ بھی کہنے کو نہ مانگا خالد
بات کہنے کو ہنر مانگ لیا

لاریب آپ کی متحرک ادبی ٹیم کی شبانہ روز کاوشوں کو خراج تحسین پیش کیا جاتا ہے۔

طالب انصاری

مکرمی عمران منظور صاحب

مسنون سلام اور بہت احترام

'بیاض' کا شمارہ بابت 2021 قدرے تاخیر سے ملا۔ اس لیے ابھی غزلیں اور نظمیں ہی مطالعہ میں آئی ہیں۔ دیگر مندرجات کا مطالعہ تا حال جاری ہے۔ غزلوں سے کچھ اشعار جو بہت پسند آئے درج کر رہا ہوں:

طرح طرح کی ہیں بولیاں اک جہاں کہاں ہے
رواں ہیں دو چار ٹولیاں کارواں کہاں ہے
جلیل عالی

مری زندگی جو گزر گئی تری دید میں
نہ وہ ماہ تھا، نہ وہ سال تھا وہ کمال تھا
جمیل یوسف

آپ کا نام زندگی ہے کیا
آپ کی گفتگو میں ربط نہیں
امجد اسلام امجد

اب کے تیور جو مرے تیغ و تبر کے بدلے
رسن و دار بھی کٹ سکتے ہیں شر کے بدلے
خاور اعجاز

اک خاموشی اس طرف پھیلی ہوئی
اک خوشی گفتگو کے اس طرف
نسیم سحر

رکی تو تھی مرے واسطے تری پالکی بھی
مگر میں اس میں سوار ہونے سے رہ گیا ہوں
اقبال سروبہ

طلب جنت کی دل میں آ گئی تھی
سو ماں کے پاؤں پڑنا پڑ گیا تھا
تصور اقبال

مرتے ہوؤں نے سانس لیے اپنے آخری
اور اس کے بعد نام و نسب خاک ہو گئے
افضل گوہر

کوئی آنکھیں غزل سرا جب ہوں
سارے نغمے فضول ہوتے ہیں
صائمہ آفتاب

شاعر امروز ایک اچھا سلسلہ ہے۔ نئے لکھنے والوں کے تازگی سے بھرے اشعار سننے کو ملتے ہیں۔ خط اس لیے جلد ہی بھیج رہا ہوں کہ شاید پچھلے شمارہ پر تبصرہ آپ کو بروقت نہیں ملا۔ اسے شامل اشاعت نہ پا کر مجھے یہ خیال آیا کہ خط جلدی بھیج دینا چاہیے۔ تاہم پچھلے رسالہ پر تبصرہ بھی دوبارہ روانہ کر رہا ہوں۔ مناسب جانیں تو شائع کر دیجیے ایک نظم بھی ارسال کر رہا ہوں۔ محترمہ نعت وحید کی شاعری پر پچھلے خط میں ایک مضمون ارسال کیا تھا۔ شائع کیے جانے کی امید ہے۔ والسلام

اشرف کمال

محترم عمران منظور، نعمان منظور صاحب
السلام علیکم
دسمبر کا شمارہ ملا، حسبِ معمول اپنی روایت کے مطابق بھرپور غزل اور نظم ونثر کے ساتھ مزین۔
حسبِ سابق شاعری کے علاوہ افسانوں اور مضامین کا خوبصورت انتخاب کیا گیا ہے۔
آغاز میں جناب خالد احمد کی نظم "آنسو" انگلیوں سے پلکوں کے نچانے کی پس پردہ کہانی کو بیان کرتی ہے۔
سید ریاض حسین زیدی کی حمد کا یہ شعر دیکھیے:

ارضِ خاکی سے اٹھائے تو نے کیا کیا آسماں　　ہیں صدف کی گود میں کیسے جواہر بے نظیر

نعت کا شعر ملاحظہ کیجیے:

تحفۂ نعت کو محفل میں سخنور لائے　　کوزۂ حرف میں خوشبو کا سمندر لائے
حسن عسکری کاظمی

اور خالد احمد کا یہ شعر دیکھیے:

حسنِ آخر نے کیا حسن کو آخر تجھ پر　　آخری روپ دیا، آخری سورت لکھی

کس طرح حسنِ آخر کو حسنِ تمام سے ملا کر نئے تلازمے شعری حوالے پیش کیے گئے ہیں۔ اس شعر کی کئی پرتیں ہیں۔
مختلف غزلوں کے درج ذیل اشعار خوب لکھے گئے ہیں:

پھول ڈرتے ہیں زرد موسم سے
سب کی اڑتی ہوئی سی رنگت ہے
آصف ثاقب

جو مری غزل میں غزال تھا، وہ کمال تھا
وہ جو تیرا عکسِ جمال تھا، وہ کمال تھا
جمیل یوسف

اک اُس سے نسبت ہی اپنی پہچان ہے ورنہ
جہان میں کوئی ہمارا نام ونشاں کہاں ہے
جلیل عالی

ریت کیوں پڑ رہی ہے آنکھوں میں
ہم جہاں ہیں یہ کوئی دشت نہیں
امجد اسلام امجد

لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ ہم دشت میں ہیں جہاں ریت ہی ریت ہے۔

شہروں سے نکالا انھیں مسموم فضا نے　　ملتے ہیں درخشندہ مضافات میں جگنو
گلزار بخاری

کچھ مضافات کے جگنو شہروں میں بھی درخشاں ہیں۔
عمر قیاز قائل کا شعر خود غرض زندگی کی سفاکی کو بیان کرتا ہے:

نگاہ پھیر لی حالات کے بدلتے ہی　　وہ میرے ساتھ رہا صرف کام آنے تک

بیاض کی خوبی ہے کہ ہر ماہ اس کی وساطت سے ہم ادب کے نئے زاویوں سے روشناس ہوتے رہتے ہیں۔ اور عصری حوالے سے لکھا گیا ادب پڑھنے کو ملتا ہے۔

محمد شفیق انصاری

محترم عمران منظور بھائی صاحب!
السلام علیکم ورحمۃ اللہ برکاتہ!
اُمید واثق ہے کہ آپ اور 'بیاض' کی ساری ٹیم کے ارکان خداوند کریم کے خاص فضل و کرم سے بخیریت ہوں گے۔
ماہنامہ بیاض، کا شمارہ دسمبر 2021 نظر نواز ہوا تو ملتے ہی پڑھنے بیٹھ گیا۔ سب سے پہلے مرشدی خالد احمد صاحب کی نظم "آنسو" پڑھی، تو دل شاد ہو گیا۔ اس کے بعد 'بیاض' کا آغاز سید ریاض حسین زیدی کی حمد سے ہوا۔ جس کا یہ شعر:

تو نے احساسِ زیاں سے اس کی آنکھیں کھول دیں
احتساب خود نگر سے جو ہوا روشن ضمیر

اس کے بعد شہاب صفدر کی حمد کا شعر:

ناخدا خود کو سمجھتا ہے خدا
اُٹھ کے کہتے ہیں بحضور اللہ اللہ

اس کے بعد سلسلہ نعت میں حسن عسکری کاظمی کا یہ شعر:

رفعتِ عرش فقط خاک نشینوں پہ کھلی!
آسمانوں کی خبر جب وہ زمیں پہ لائے

میں تصور میں پہنچ جاتا ہوں قدموں کے قریں
اشک ہوتے ہیں رواں نعت لکھی جاتی ہے
سرور حسین نقشبندی

آپ کے ہاتھوں ملے گی ایک دن صورت مجھے
اس لیے میں آج تک اُترا نہیں ہوں چاک سے
غلام حسین ساجد

تمام خلق تھی مصروف بُت پرستی میں
خدا کے دین کو سنبھالا حضورؐ نے آکر
محمود کیفی

'بیاض' کے اس شمارے میں عقیدت کے پھول نچھاور کرتے ہوئے نظر آتے ہیں:

اسے دکھایئے آیت مباہلہ والی
وہ کہہ رہا ہے محمدؐ کی آل ہے ہی نہیں
افضل حسن

خاتم الانبیاء حسنِ جود و سخا
ان سا حاکم کوئی بھی کہیں بھی نہیں
راجہ عبدالقیوم

وہ تاجدارِ مدینہ کے اک غلام کی ہے
جو بامِ کعبہ پہ گونجی تھی اک اذانِ حرم
مرزا آصف رسول

خالد علیم صاحب کی خوبصورت رباعی:

دھوکا ہے، سراب ہے، سزا ہے، کیا ہے؟
آئینہ ہے سامنے، خفا ہے، کیا ہے؟
خود پر ہی بار بار پڑتی ہے نظر
میں ہوں، تو ہے، کوئی یا ہے، کیا ہے؟

انگلش سے اردو میں ہائیکو کا خوبصورت ترجمہ خاور اعجاز نے کیا۔ اس کے ساتھ ہی ممتاز راشد لاہوری کے ماہیے بھی اور گلزار بخاری کا گیت بھی اس شمارہ کی زینت ہیں۔

سلیمان عبداللہ زار کا تصوف پہ مبنی "کاٹھ کباڑ" اچھا ہے۔

سیدہ آیت گیلانی کا مرشدی خالد احمد صاحب کے نعتیہ مجموعے "تشبیب" کا فکری، اکتسابی و عددی مطالعہ جس کی یہ پانچویں قسط ہے۔ اس میں سیدہ آیت گیلانی نہایت باریک بینی اور جانفشانی سے تنقیدی و تحقیقی جائزہ لے رہی ہیں وہ پڑھنے والوں کے لیے ایک خاصے کی چیز ہے۔ اور تنقیدی و تحقیقی ادب میں ایک خوشگوار اضافہ ہے۔

افسانوں میں سب سے پہلا افسانہ "ماں اور بیٹا" ہے جو کہ حنیف باوا نے Valentin Katayav کے افسانہ کو اردو قالب میں ڈھالا ہے۔ اس کے ساتھ محمد حنیف کا "مجرم کون؟" افشاں سجاد کا "وہ غمگساری میری" اور ثمینہ سید کا "پارسائی" نور کمال شاہ کا "بے چارگی" اور نوین روما کا افسانہ "چکر" خوبصورت افسانے ہیں۔

"شاہ داستان" ایک سابق بیوروکریٹ شوکت علی شاہ کی قسط وار کہانی ہمیں اپنے حصار میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں ایک بیوروکریٹ بیوروکریسی کی خوبیاں اور خامیاں اپنے پڑھنے والوں کے لیے آشکار کر رہا ہے۔ اس میں ایک سلیس اور خوبصورت انداز میں ماضی کی تاریخ کو درجہ بدرجہ سمویا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ موجودہ حالات تک آنے میں بیوروکریسی کی غلطیاں ہیں، جن کو تاریخ کبھی فراموش نہیں کر سکتی۔

اظہار پا کے بھی وہ کب اظہار پا سکا
بے ربط لفظ ، درد کی پوشاک ہو گئے
خالد احمد

میرا کاسہ تہی نہیں ثاقب
اس میں مانگی ہوئی محبت ہے
آصف ثاقب

اک اس سے نسبت ہی پہچان ہے ورنہ
جہاں میں کوئی ہمارا نام و نشاں کہاں ہے
جلیل عالی

آپ کا نام زندگی ہے کیا؟
آپ کی گفتگو میں ربط نہیں
امجد اسلام امجد

آدمی عشق کے نشے میں غرق
عشق کمبخت روزگار میں گم
محسن اسرار

آخر کار نہ پہنچے کسی منزل پہ بھی وہ
راستے اپنے جنھوں نے بھی سفر کے بدلے
خاور اعجاز

بس اتنا سا یاد ہے کہ اک دن وہ اتریں آب حیات لے کر
مگر نہیں اتنا یاد، پھر کیسے لے گئیں سوئے دار آنکھیں
محمد انیس انصاری

رات ، فٹ پاتھ، نشہ ، قربت دل جو اس کی
مجھ کو تھامے ہوئے چلتی رہی خوش بو اس کی
راحت سرحدی

موت صحرا میں چمکتے پانیوں کا سلسلہ
زندگی برسات میں کچے مکانوں کی طرح
یونس خیال

ہوائے وحشت فضا سربسر ہے عالم میں
ہجوم پھر بھی قبائیں اٹھائے پھرتا ہے
فرحت عباس

بے چہرگی کے خوف نے سب کو ڈرا دیا
جو رہبر حیات تھے ، جینے سے ڈر گئے
علی اصغر عباس

اب کیا تمھیں بتائیں کہ کب خاک ہو گئے
تب پوچھنے کو آئے ہو جب خاک ہو گئے
افضل گوہر

وہ تلوار سے کب ڈرتے ہیں
جن کے ہاتھ قلم ہوتے ہیں
کرامت بخاری

یہ کون عکس ہے مجھے اس کی خبر نہیں
میں نے تو ایک شکل کبھی کی بھلا بھی دی
قمر رضا شہزاد

جس نے جانا ہی نہیں راز مری باتوں کا
وہ مرے خواب خیالوں سے سمجھتا ہے مجھے
نیلما ناہید درانی

میں نے اک عمر گزاری ہے تری صحبت میں
شہر والوں سے کہاں میری طبیعت ملتی
اشرف کمال

جس کو آنکھوں نے کبھی دیکھا نہیں
عمر گزری ہے اسی کے ذکر میں
محمد نوید مرزا

کون سمجھے قلم کی مجبوری
چلتے چلتے ، دوات سو جائے
ارشد محمود ارشد

میں تو اک گم شدہ خزانہ ہوں
زندگی میں تلاش کر مجھ کو
روما رضوی

میرا اب آئنے پہ بھروسہ نہیں رہا
مجھ سے ملاتا اس کو جو مجھ سا دکھائی دے
دانش عزیز

یہ قبریں ہیں کہ بڑھتی جا رہی ہیں
عجب رسم فنا پھیلی ہوئی ہیں
فیض رسول فیضان

خواب میں تنگ انھیں کرتا ہے شاید کوئی
نیند میں لوگ جو بیدار نظر آتے ہیں
زبیر فاروق

نکلا حصارِ ذات سے میں ایک جست میں
بے شک مجھے گلی گلی اب تو پھرائے عشق
وسیم جبران

یوں میری خامیوں سے حسد کر رہے ہو کیوں
تم ایسے اختلاف کی حد کر رہے ہو کیوں
عدنان خالد

انسان ہی تو سب سے بڑا ہے خدا پرست
انسان ہی تو سب سے بڑا بُت تراش ہے
شاہد ماکلی

سبھی کو بات مری آگئی پسند بہت
کچھ اس لیے بھی کہ سب کی یہی کہانی ہے
فخر عباس

دیپ اشکوں کے جلاکر سحرِ نو کے لیے
ایک اک فرد کو گھر سے ہے نکلنا پڑتا
سہیل یار

آسمانوں کے اس طرف کیا ہے
تو فسانے سنانے والا کون
نوید صادق

سلسلہ شاعرِ امروز میں شاہد ماکلی نے جواد جاذل اور نادر عریض کا تعارف اور اُن کی خوبصورت شاعری پر بھرپور مضمون لکھے تو ساتھ ہی ہمایوں خاں کا مضمون ''گمشدہ تنخواہیں'' ہمیں ہنسنے پر مجبور کر دیتا ہے۔
'بیاض' میں سلسلہ نظم ایک خاص گوشہ ہے جس میں سینئرز اور جونیئر شعرا کی نظمیں پڑھنے کو ملتی ہیں۔ آصف ثاقب کی ''دعا'' امجد اسلام امجد کی 'سلام عرا' خورشید رضوی کی 'زمانے سے باہر' حامد یزدانی کی جناب اختر حسین جعفری کے لیے ''سفر کی شاخ پر'' نائلہ راٹھور کی نثری نظم اور آسناتھ کنول، وزعیم رشید اور راز ہرندیم کی نظمیں شاندار ہیں۔
والسلام

محمد آفتاب تابش

محترم جناب عمران منظور صاحب!
السلام علیکم!
امید ہے مزاجِ گرامی بہ خیر ہوں گے۔ ماہِ جبر کا آغاز، وصل ''بیاض'' سے ہوا، اچھا لگا۔ سرورق سے تا پس ورق یہ شمارہ دیدہ زیب و دل کش تحریروں کا مرقع ہے۔ جناب خالد احمد صاحب کی نظم 'آنسو' بہت پسند آئی۔ 'کاٹھ کباڑ' از سلیمان عبداللہ، ایک متاثر کن تحریر تھی۔ جن اشعار نے دامنِ دل کو کھینچا ہے اُن میں سے چند ایک درج ذیل ہیں:

تحفۂ نعت جو محفل میں سخن ور لائے
کوزۂ حرف میں خوشبو کا سمندر لائے
حسن عسکری کاظمی

حُسن آخر نے کیا حسن کو آخر تجھ پہ
آخری روپ دیا، آخری سورت لکھی
خالد احمد

روشنی آنکھ میں اتر آئے
دل کو صورت کوئی نظر آئے
سید ریاض حسین زیدی

عمر ڈھلتے ہی ہر اک شے پہ زوال آتا ہے
روشنی چاند کی بھی ختم ہوئی آخرِ شب
شوکت محمود شوکت

اللہ سے دعا ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کی ساری ٹیم کو سلامت رکھے اور آپ یوں ہی ادب کی بے لوث خدمت جاری رکھیں۔
آمین!

والسلام

رانا محمد شاہد

محترم عمران منظور، اعجاز رضوی صاحب

السلام علیکم!

دسمبر کے سرورق پہ مختلف رنگ خوبصورتی میں اضافہ کر رہے تھے تو پس ورق پہ ادارے سے وابستہ افراد اپنے رنگ بکھیر رہے تھے۔ تصوف کے موضوع پر سلیمان عبداللہ ڈار کی خوبصورت تحریر پڑھنے کو ملی۔ ثمینہ سید کا افسانہ 'پارسائی' پڑھتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ اسے ایک دو سال پہلے بھی 'بیاض' میں پڑھا ہے۔ ممکن ہے دوبارہ شائع ہو گیا ہو۔ وقار احمد ملک کا 'سوجی والے بسکٹ' احساسات و جذبات میں گندھا افسانہ دل کے بہت قریب لگا۔ چمن کے مالی رخصت ہو جائیں تو ان کی یادیں، باتیں ہی انسان کا سرمایہ ہوتی ہیں۔ خالد احمد نے عشقِ رسولؐ سے اپنے قلب کو زندہ کیا۔ انھوں نے اپنے نعتیہ مجموعے 'تشہیر' میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظیم شخصیت سے وابستہ ان تمام حوالوں کو موضوعِ سخن بنایا ہے۔ جو انسانی زندگی کے ہر پہلو کا احاطہ کرتے ہیں۔ انھوں نے اپنی نعتیہ شاعری سے ایک حقیقی سچی اور موجود شخصیت سے اپنے قاری کو عقیدت و محبت کی لڑی میں پرو دیا ہے۔

سید وآیت گیلانی مبارکباد کے مستحق ہیں کہ انھوں نے اس نعتیہ مجموعے پر اس قدر باریک بینی اور دانش مندی سے اظہارِ خیال کیا۔

دسمبر کے شمارے میں درج ذیل اشعار پسند آئے:

سبھی زاویے، سبھی دائرے اُسی لہر کے
وہ جو میرا نقشِ خیال تھا، وہ کمال تھا
وہ شجر تھا کوئی کہ جس کے نیچے ملے تھے ہم
کوئی خواب تھا کہ خیال تھا وہ کمال تھا
جمیل یوسف

اپنے سائے میں بیٹھنا ہو گا
دشت میں دور تک درخت نہیں
دل وہ قاتل نہیں بھروسے کے
درد کی مہر جس پہ ثبت نہیں
امجد اسلام امجد

تجھے میری ضرورت ہے فقط تیری ضرورت تک
ارے پاگل! تری بابت میں ایسا سوچ سکتا ہوں؟
مجھے سوچوں کی وسعت سے کوئی مطلب نہیں دانش
بڑی دل کو تسلی ہے میں جتنا سوچ سکتا ہوں
دانش عزیز

وار تو سامنے سے کرنا سیکھ
جنگ کے بھی اصول ہوتے ہیں
کوئی آنکھیں غزل سرا جب ہوں
سارے نغمے فضول ہوتے ہیں
صائمہ آفتاب

سقوطِ مشرقی پاکستان پر نسیم سحر کی نظم بھی زیرِ دست رہی۔ برس کے آخری منظر' شبہ طراز کی نظم بھی پسند آئی۔

نئے سال کا آغاز ہو رہا ہے۔ انسان نئے سال کے آغاز میں بہت سے منصوبے بناتا ہے۔ اسے بنانے چاہئیں، مگر کوشش کرے کہ وہ ایسا بن جائے جس سے دوسروں کو فائدہ ہو، جو غم زدہ چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دے۔ جس سے کسی دوسرے کی ڈوبتی کشتی کنارے جا لگے۔ جس سے کسی دوسرے میں جینے کی اُمید، امنگ پیدا ہو۔ ایک ایسا مسافر جس سے دوسروں کا سفر آسان ہو جائے۔

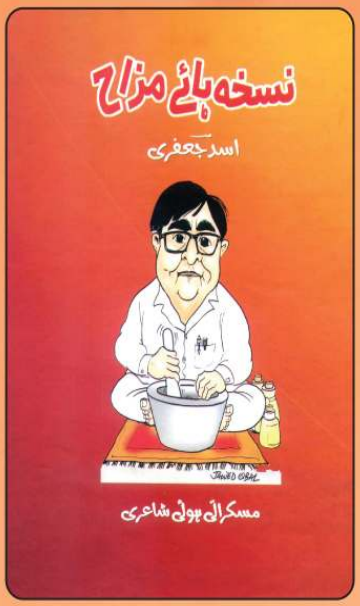
نسخہ ہائے مزاح
اسد جعفری
مسکراتی ہوئی شاعری

تین گلاب
عثمانہ افشر جمال

اٹلانٹس
زندہ کتابیں
169
سرّی ادب کا پہلا اور "آخری آدمی"
(این صفی کی تحریروں کا ادبی و تحقیقی تجزیہ)
تبسم حجازی
مرزا صہیب اکرام

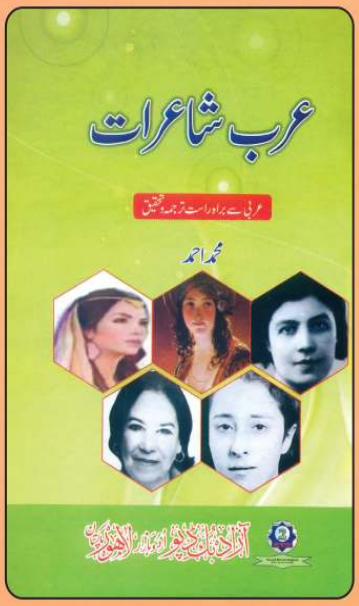
عرب شاعرات
عربی سے براہ راست ترجمہ و تحقیق
محمد احمد

AKG CANADA
Visa Immigration Services

iccrc
IMMIGRATION CONSULTANTS OF CANADA REGULATORY COUNCIL

AKG CANADA

VISA IMMIGRATION SERVICES

We are a Canadian based licensed immigration practicing firm, providing customized solutions and advise on matters related to Canadian Immigration

HERE'S WHAT WE OFFER:-

- Express Entry
- Permanent Residence
- Provincial Nominee Program
- Family class sponsorship
- Visitor Visa
- Student Visa
- Business Investor Immigration
- Immigration Refugee

www.akgcanada.com info@akgcanada.com +1-647-617-0888